مکمل ناول

اک عمر کے بعد

نگہت سیما

"اور یہ میں ہوں سویرا اقبال......" میں نے آسمانی ساڑی کا پلو کندھے پر ڈالتے ہوئے اپنا جائزہ لیا۔

"دنیائے ادب کا ایک درخشاں ستارہ اور ایک ذمے دار سرکاری افسر...... لوگ کہتے ہیں میں بہت کامیاب عورت ہوں لیکن کیا میں واقعی کامیاب ہوں......؟ کبھی، کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں دنیا کی ناکام ترین عورت ہوں۔ زندگی کے ہر

میدان میں جھنڈے گاڑنے کے باوجود میرے جیسی ناکام عورت کوئی نہیں...... اور اس ناکام عورت کی زندگی پر بے شمار لوگ رشک کرتے ہیں...... صبح سے لے کر شام تک کتنی ہی بار یہ جملے میرے کانوں میں پڑتے ہیں۔

''میم! آپ بہت خوش قسمت ہیں۔''

''ارے سویرا! اقبال بہت لکی ہیں۔''

ہاں ان کی نظروں میں واقعی میں خوش قسمت ہوں، کیا نہیں ہے میرے پاس دولت، شہرت، عزت، حسن، دلکشی...... ہاں سبھی کچھ تو ہے بس....

میں نے ایک بار پھر خود کو آئینے میں جانچا...... میں کوئی ایسی حسین و جمیل نہیں ہوں کہ جس کے حسن کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کردیے جائیں لیکن اتنی خوب صورت ضرور ہوں کہ اکثر میں نے مردوں کی نظریں اپنی طرف اٹھتی اور پھر ٹھہرتی محسوس کی ہیں...... حالانکہ میں کوئی جوان لڑکی نہیں...... میری عمر بتیس سال ہے۔ یہ الگ بات ہے میں بتیس سال کی عمر میں بھی پچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا قیمتی پرفیوم اٹھا کر اسپرے کیا اور ایک آخری نظر آئینے پر ڈال کر باہر نکلی تو برآمدے میں ماسی خیراں کھڑی تھی۔

''میڈم جی وہ سراج الحق اور عرفان منیر صاحب آئے ہیں۔ وہی جی اخبار والے۔''

میں نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا...... میں پہلے ہی لیٹ تھی۔ آج ضلعے کے تمام اسکولوں کے... سربراہوں کے ساتھ میری میٹنگ تھی...... میٹنگ دس بجے تھی اور اس وقت نو بجے تھے...... میں عموماً آٹھ بجے تک آفس چلی جاتی تھی لیکن پچھلے دو ہفتوں میں مسلسل کام کی زیادتی نے مجھے تھکا دیا تھا۔ بہت سارے کام نمٹانے کے بعد میں رات نیند کی گولی کھا کر سوئی تو صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تھی...... مجھے یہاں آئے دو ہفتے ہی ہوئے تھے اور ان دو ہفتوں میں بے حد مصروف رہی تھی۔ میرے آفس میں بہت سی فائلیں تھیں جنہیں دیکھنا تھا۔ ملاقاتیوں کی آمد اور انہیں مطمئن کرنا، کسی کی پنشن کا مسئلہ تھا، کوئی بینیوولینٹ فنڈ کے اجرا کے لیے خوار ہو رہا تھا۔ کسی کے ڈیوز ادا نہیں ہوئے تھے، کسی کو اپنا گریڈ چاہیے تھا اور کسی کو اپنے علاقے میں ٹرانسفر کروانا تھا...... دراصل ڈی ای او کی یہ سیٹ پچھلے دو ماہ سے خالی پڑی تھی اور بہت سے کام رکے ہوئے تھے۔ میں اس شہر میں نئی تھی اور چاہتی تھی کہ لوگوں پر میرا اچھا تاثر ہو اور میں انہیں مطمئن کرسکوں...... بظاہر تو سب نے ہی میری پوسٹنگ پر خوشی کا اظہار کیا تھا اندر کا حال اللہ جانتا ہے۔ غیر رسمی طور پر میری ملاقات چند مڈل اور پرائمری اسکولوں کے ہیڈ سے ہوچکی تھی اور مجھے علم ہوا تھا کہ بچے پرائمری اور مڈل اسکولوں میں بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک مڈل اسکول کی ہیڈ نے مجھے بتایا کہ اس کے اسکول میں صرف پچیس طالبات ہیں، یہ فکر انتہائی پریشان کن تھا۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم فری ہونے کے باوجود لوگوں کا رجحان ابتدائی کلاسوں میں پرائیویٹ اسکولوں میں زیادہ کیوں ہے...... ایسے اسکول جن میں طالبات کی تعداد زیادہ نہیں ہے ختم ہوجانے چاہئیں کہ یہ حکومت کے خزانے پر بوجھ ہیں۔ ہاں ہائی اسکولوں میں تعداد بہت زیادہ تھی۔ جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ والدین بنیادی تعلیم کے لیے پرائیویٹ اسکولوں کے اخراجات برداشت کرلیتے ہیں لیکن ہائی کلاسز کے نہیں...... گورنمنٹ ٹیچرز کی تنخواہیں بہت تھیں...... جن کی سروس زیادہ تھی وہ کافی زیادہ تنخواہ لے رہے تھے پھر دوسری سہولتیں فل پینشن' اس کے باوجود معیارِ تعلیم پرائیویٹ اسکولوں کے مقابلے میں بہتر کیوں نہیں تھا...... اسی سب پر بات کرنے کے لیے میں نے یہ میٹنگ رکھی تھی۔ میں جانتی تھی میری باتیں کچھ کو بری لگیں گی...... لیکن مجھے کرنا بھی ضرور

تھیں کہ کم تنخواہ میں پرائیویٹ اسکولوں کے ٹیچرز اتنی محنت کرتے ہیں تو سرکاری اسکولز کے ٹیچرز کیوں نہیں کرسکتے اور مجھے یقین تھا کہ میری بات سنی جائے گی......اور ہم کوئی حل نکال لیں گے۔

''میڈم جی......!''

ماسی خیراں نے مجھے پھر پکارا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا کہوں جی انہیں......؟''

''اچھا چلو میں آتی ہوں، تم جوس لے آنا۔'' میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچا کھڑے، کھڑے ہی بات کرلوں...... یہ شخص پچھلے تین دنوں سے آفس آرہا تھا اور میں مل نہیں پارہی تھی حالانکہ میرے آفس کے کلرک نے مجھے چھپے لفظوں میں ڈرانے کی بھی کوشش کی تھی کہ مجھے اخبار والوں کے ساتھ بنا کر رکھنی چاہیے کہ انہوں نے کچھ خلاف چھاپ دیا تو کون تردید کرتا پھرے گا۔ میں یہ بات جانتی تھی کہ کلرک صحیح کہہ رہا ہے۔ اپنی دس سالہ جاب کے تجربے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا...... جاب کے دو، تین سال کے بعد ہی میں نے جان لیا تھا کہ مجھے لوگوں کے ساتھ کیسے اور کس طرح کا رویہ رکھنا ہے۔ سو میں نے سراج الحق اور عرفان منیر سے اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے معذرت کر کے دو تین روز کی مہلت چاہی تھی لیکن یہ آج آفس کے بجائے گھر آگئے تھے اور اگر اس وقت میں نہ ملتی تو یقیناً وہ انسلٹ محسوس کرتے۔ میں خیراں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی تو وہ دونوں کھڑے ہوگئے...... دونوں کی نظروں میں موجود اشتیاق کو بھانپتے ہوئے میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تشریف رکھیں پلیز...... میں معذرت خواہ ہوں کہ پہلے ملاقات نہیں کرسکی...... دراصل کام کی بے تحاشا مصروفیت ہے......اور......''

''ہم آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لیں گے میم......!'' سراج الحق کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں بلا کی مکاری تھی۔

''جی فرمائیں، میرے لائق کیا خدمت ہے؟'' میں نے خیراں کو جوس لانے کے لیے کہا اور بیٹھ گئی۔

''ایکچوئلی ہم آپ کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں، اپنے اخبار کے لیے...... میں دراصل ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا ہوں۔''

''لیکن میرا انٹرویو کس سلسلے میں......؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا آپ ہر نئے آنے والی ڈی ای او کا انٹرویو اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں؟''

''ہر ڈی ای او سویرا اقبال نہیں ہوتی۔'' اس کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی مجھے مزید حیرت ہوئی تھی۔

''سویرا اقبال میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' میں نے اپنی حیرت چھپائی۔

''خاص بات......؟'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''آپ کی نئی تبدیلیوں نے تو تہلکہ مچا رکھا ہے جناب۔'' اب کے وہ کھل کے سامنے آیا تھا۔ ''مضامین پر مضامین لکھے جارہے ہیں۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ شخص انتہائی کائیاں تھا، پتا نہیں اس کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا۔ ورنہ میری حتی الامکان یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ میں کون ہوں...... سویرا اقبال نام کی صرف ایک میں ہی تو نہیں سیکڑوں لڑکیاں ہوں گی...... لیکن اس نے جس یقین سے بات کی تھی لگتا تھا کہ یہ شخص پورا ہوم ورک کر کے آیا ہے، سو اب مکرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا...... البتہ دل میں مجھے انتہائی کوفت ہوئی تھی...... پچھلے شہر میں تقریباً دو سال میرا قیام رہا تھا

لیکن کسی کو علم نہیں ہو سکا تھا کہ میں وہی سویرا اقبال ہوں جس کی شاعری کی دھوم ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ سراج الحق نے اس طرح چناتی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو...... دیکھا تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اب وہ میری شاعری کی تعریف میں رطب اللسان تھا......

عرفان منیر نے بھی تعریف کرنے کے بعد مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ دیا۔

''سوری، میں مشاعروں میں نہیں جاتی۔''

''لیکن یہ مشاعرہ تو ہم آپ کے اعزاز میں کر رہے ہیں۔ آپ کا ہمارے شہر میں آنا ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے۔''

''میرے لیے بھی یہ اعزاز ہے، عرفان صاحب کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں...... لیکن میں نے جب اس خارزار میں قدم رکھا تھا تو اپنے لیے کچھ اصول بھی بنائے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے مشاعرہ نہیں پڑھنا تو میں معذرت خواہ ہوں کہ اپنا اصول توڑ نہیں سکتی۔''

عرفان منیر کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔

''اور انٹرویو میڈم...... وہ تو آپ دے رہی ہیں ناں......'' سراج الحق کا لہجہ اب بھی پریقین تھا۔

''پچھلے تیرہ سالوں سے میرا کلام اور میری کہانیاں ادبی پرچوں میں چھپ رہی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کہیں میرا انٹرویو دیکھا، پڑھا؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے انٹرویو کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔''

''چلیں وعدہ رہا جب کبھی میرا ارادہ بنا انٹرویو دینے کا تو یہ اعزاز آپ کے اخبار کو ہی ملے گا۔'' میں نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی...... میں جانتی تھی کہ اگر یہ لوگ کبھی کسی مشکل میں کام آ سکتے ہیں تو میرا جینا بھی حرام کر سکتے ہیں۔

''میری خوش قسمتی ہوتی اگر آپ کا انٹرویو ہمارے اخبار میں چھپ جاتا۔'' سراج الحق کے لہجے میں ہلکی رکھائی تھی جسے میں نے محسوس کیا۔

''بہرحال آپ کو مجبور تو نہیں کیا جا سکتا...... یہی اعزاز کیا کم ہے کہ آپ نے ملاقات کا شرف بخشا۔'' بظاہر وہ بچھا جا رہا تھا لیکن میں سمجھ سکتی تھی کہ میرے سامنے بیٹھا شخص کس قدر منافق اور دوغلا ہے۔

''کیا غضب کا لکھتی ہیں آپ...... جیسے تحریر نہیں موتیوں کی مالا ہے۔ ایک ایک لفظ سونے میں تلنے والا۔ ویسے کیا آپ کے خاندان میں کسی اور کو بھی ادب سے دلچسپی ہے؟'' عرفان منیر بھی سراج الحق سے کم چالاک نہیں لگ رہا تھا۔

''نہیں......'' میں نے مختصر جواب دے کر ماسی خیراں کی طرف دیکھا جو انہیں جوس پیش کر رہی تھی۔

''آپ کے والد بھی کیا ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ سے متعلق ہیں؟'' گویا وہ غیر رسمی انٹرویو کا آغاز کر چکا تھا۔

''نہیں......''

میرا جواب اب بھی مختصر تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ میرے متعلق جاننا چاہتا ہے اور میں ایسا نہیں چاہتی تھی...... میں نے کلائی موڑ کر ٹائم دیکھا حالانکہ میرے بالکل سامنے کلاک تھا۔

''اقبال آپ کے والد کا نام ہے یا......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''نہیں، یہ میرے نام کا حصہ ہے۔'' میں نے پھر کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور بالآخر سراج نے سمجھ لیا جو میں سمجھانا چاہتی تھی۔

''اوہ سوری، آپ کو دیر ہو رہی ہے۔'' وہ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ ''انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔''

''ضرور......'' میں اخلاقاً مسکرائی۔

''انٹرویو کے متعلق ضرور سوچیے گا میم...... آپ

پتا نہیں انٹرویو دینے سے کیوں کتراتی ہیں..... حالانکہ آپ اگر انٹرویو دیں گی تو آپ کی شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔" عرفان منیر نے بھی اٹھتے ہوئے کہا تو سراج نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے شاباش دی۔

"میرا خیال ہے جتنی شہرت اور عزت مجھے ملی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور شہرت حاصل کر کے میں کیا کروں گی، منیر صاحب۔"

"کوئی تو وجہ ہوگی، کیا فیملی پسند نہیں کرتی؟" عرفان منیر کی آنکھیں جیسے مجھے اندر تک کھوج آنا چاہتی تھیں۔

"یہی سمجھ لیں۔"

سراج الحق کی آنکھیں، لمحے بھر کے لیے تمسخر اڑاتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ خوب سمجھتے ہیں ہم کہ تمہارے پس منظر میں ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔

"دراصل اپنے پسندیدہ لوگوں کے متعلق سب کو ہی جاننے کا تجسس ہوتا ہے..... ان کا ماضی، خاندانی پس منظر سب کچھ......"

"چلیے سراج صاحب کبھی ان کا تجسس دور کردیں گے۔ فی الحال تو......" میں نے کلائی موڑ کر پھر وقت دیکھا تو وہ دونوں حضرات خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوگئے۔ میں انٹرویو کیوں نہیں دیتی تھی اور میرا پس منظر کیا تھا۔ میں جانتی تھی سراج ہی نہیں کئی دوسرے بھی جاننا چاہتے تھے..... اور یقیناً اندازہ لگاتے ہوں گے کہ میرے ماضی میں ضرور کچھ ایسا ہے جو بتانے لائق نہیں ہے۔

"منافق اور دوغلے لوگ......" میں نے زیرلب ....کہا اور ساڑی کا پلو درست کیا۔

"لیکن کیا تم خود بھی منافق نہیں ہو۔" میرے اندر سے آواز آئی لیکن میں نے اس آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ میں اپنے آپ کو منافق نہیں سمجھتی تھی بلکہ اپنے منافقت بھرے رویے کو اپنی مجبوری گردانتی تھی۔ اگر میں یہ رویہ نہ رکھوں تو یہ لوگ تو مجھے کچا کھا جائیں...... اور یہ میں نے بہت پہلے جان لیا تھا...... اور لوگوں کے باطن کی خباثتیں دیکھنا سیکھ لی تھیں۔

"میڈم جی آپ نے آفس نہیں جانا؟" ماسی خیراں نے ٹیبل سے خالی گلاس اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں نے چونکتے ہوئے کلاک پر نظر ڈالی۔ پونے دس ہو رہے تھے۔ یک دم میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا...... اور ایسا ہوتا تھا کبھی کبھی۔

"نہیں......" میں ایک گہری سانس لے کر وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی...... اور ہینڈ بیگ سے اپنا فون نکال کر اپنے آفس کے کلرک ساجد خان کو فون کرکے میٹنگ کینسل کرنے کے لیے کہا۔

"جی خیریت ہے ناں......؟"

"ہاں ساجد کوئی مسئلہ ہے...... مجھے کہیں جانا ہے۔ دوبارہ کب میٹنگ ہوگی پھر بتادوں گی...... کوئی آیا تو نہیں ہے ابھی تک؟"

"نہیں میڈم......! صرف ایک پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم سب کو فون کرکے بتادو۔" میں نے فون بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

میں سویرا اقبال جو میانے ہزارے کی جم پل تھی۔ میں نے آج تک کسی کو انٹرویو نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب میری پہلی کتاب کو ہی آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا...... اس لیے کہ میں پورا سچ نہیں بول سکتی تھی اور آدھا سچ ہمیشہ ڈیل کرتا ہے۔ یا پورا سچ یا پورا جھوٹ۔

میں نے آج تک کسی اخبار یا رسالے کو انٹرویو نہیں دیا تھا اس لیے نہیں کہ خدانخواستہ میرا ماضی شرمناک تھا اور میرا پس منظر بتانے لائق نہیں تھا...... جیسا کہ سراج الحق کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں سے

شک جھلکتا ہے، میرا ماضی دوسروں کے لیے شرمناک نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے میرے لیے ہو۔

میں میانے ہزارے کے ایک کسان دین محمد کے گھر پیدا ہوئی اور صوبیدار صابر حسین اور استانی جی کے گھر پلی بڑھی...... میرے حوالے میرا مان تو ہو سکتے تھے میری شرمندگی نہیں...... تو میرا باپ میانے ہزارے کا کسان دین محمد تھا جو غریب تھا نہ امیر...... بس اچھا گزارہ ہوتا تھا۔ پہننے، اوڑھنے، کھانے، پینے کو اچھا ملتا تھا...... مجھ سے بڑی میری چار بہنیں اور ایک بھائی تھا...... دو بہنیں بڑی تھیں پھر بھائی پھر دو بہنیں...... میرا باپ ایک خاموش طبع اپنے کام میں مگن رہنے والا انسان تھا۔ اس نے بہنوں کی پیدائش پر واویلا کیا نہ مزید بیٹے کی خواہش کی تھی، یہ اماں تھیں جنہیں مزید ایک بیٹے کی خواہش تھی۔

''میرا وانیاں اکیلا ہے۔ ایک بیٹا اور ہو جائے تو میرے وانو کا بازو بن جائے۔ اس کا جوڑا...... کلّا (اکیلا) تو درخت بھی چنگا نئی لگدا......'' سو ودانی کے جوڑے کی خواہش میں مزار پر منت مانتی اور دیے جلاتی پھرتی تھیں اور ودانی کے بازو کے بجائے میں آگئی...... مجھے یقین ہے مجھے دیکھ کر اماں نے نفرت سے منہ پھیر لیا ہوگا۔ مزید بیٹے کی خواہش میں اوپر تلے تین بیٹیاں تو آچکی تھیں۔ پتا نہیں میرے بعد اماں کے دل میں بیٹے کی خواہش مری تھی یا نہیں لیکن میرے بعد گھر کی نفری میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ میں چھ سال کی ہوگئی تھی۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی، سنا ہے چھوٹے بچے سب کو بہت پیارے ہوتا ہے لیکن مجھے کبھی ایسا نہیں لگا تھا کہ میں گھر میں سب کی پیاری ہوں۔ ابا شام کو تھکا ہارا کھیتوں سے آتا تو اس کے پاس اپنی اولاد کے لیے کوئی محبت بھری نظر یا بول نہیں ہوتے تھے۔ وہ اکثر صحن یا برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ جاتا، میری بڑی بہن شانو اس کے لیے حقہ تازہ کر کے لاتی۔ اماں چنگیر میں روٹیاں اور سالن کی کٹوری رکھ کر چارپائی پر رکھ دیتی...... ہمارے ہاں رات کا کھانا سر شام ہی کھا لیا جاتا بلکہ دیہاتوں میں اکثر گھروں میں کھانا اب بھی سر شام ہی کھا لیا جاتا ہے۔ ابا بھی کھانا کھا کر اور حقہ پی کر چارپائی پر لیٹ جاتا۔ دوسرے نمبر والی بہن عاشو، ابا کے پاؤں دباتی اور ابا ودانی سے دو چار باتیں کر کے سو جاتا۔ میں ابا کی چارپائی کے گرد منڈلاتی رہتی کہ ابا مجھے گود میں اٹھائے، چارپائی پر پاس بٹھائے اور کھانا کھاتے ہوئے میرے منہ میں بھی نوالے بنا بنا کر ڈالے۔ پتا نہیں یہ کیسی حسرت تھی جو چھ سال کی عمر میں بھی دل کے اندر کہیں چھپ کر بیٹھ گئی تھی...... شاید میں تب سے ہی بہت گہرائی سے سوچنے لگی تھی۔ ابا تو ایک طرف اماں نے بھی میری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شانو اور عاشو ہی مجھے نہلاتی، دھلاتی اور کپڑے پہناتی تھیں۔ شاید پیدا ہوتے ہی انہوں نے مجھے سنبھال لیا تھا۔ اماں نے صرف دودھ پلانے کا کام کیا تھا۔ ورنہ انہیں تو جب بھی موقع ملتا ایک آدھ دھموکا جڑ دیتیں...... میں گود میں جانے کو مچلتی تو دھکیل دیتیں۔

''چل پیچھے ہٹ نامراد......''

پتا نہیں نامراد میں تھی یا میری آمد سے وہ نامراد رہ گئی تھیں کہ وہ وجہ بلاوجہ مجھے ایک دو تھپڑ لگا دیتیں...... چھ سال کی عمر میں شاید کوئی اتنا حساس نہیں ہوتا ہوگا جتنا میں تھی...... تھپڑ کھا کر بھی انہی کی طرف لپکتی...... آنکھوں میں آنسو بھر کر اس آس سے انہیں تکتی کہ وہ مجھے بھی گود میں لے کر میرا ماتھا اور رخسار چومیں جیسے ودانی کے چومتی ہیں بلکہ مجھ سے بڑی پینو کو بھی اماں کبھی کبھار چوم لیتیں۔ جب وہ سیڑھیوں سے گری تھی تب اور جب اسے بخار ہوا تھا تب...... میں نے دیکھا تھا۔ اماں بار، بار اسے پیار کر رہی تھیں۔ تب میں بھی سیڑھیوں سے گر گئی۔ پتا نہیں جان بوجھ کر گری تھی یا خود ہی گر گئی تھی شعور میں نہیں

ہے لیکن گرنے کے بعد آس سے اماں کی طرف دیکھا ضرور تھا کہ وہ مجھے بھی جو کی طرح پیار کریں گی لیکن اماں نے الٹا مجھے ایک تھپڑ جڑ دیا۔

"تو چھت پر کیا کرنے گئی تھی؟" ہاں شانو نے مجھے ضرور گود میں اٹھا لیا تھا اور ہمدردی سے میری چوٹ سہلانے لگی تھی۔ میں حلق پھاڑ، پھاڑ کر رو رہی تھی لیکن اماں ٹس سے مس نہیں ہوئی تھیں اور آرام سے بیٹھی دانی کے کرتے پر پھول کاڑھتی رہیں..... اور یہ اس سے دو روز بعد کی بات ہے..... اماں صحن میں مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی تھیں۔ لکڑیاں گیلی تھیں اور سارے گھر میں دھواں بھرا تھا اور پھونکنی سے پھونکیں مارتے، مارتے اماں کی سانس چڑھ رہی تھی اور دھوئیں سے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہ دانی روتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

"ارے کیا ہوا میرے لال---؟" اماں نے کلیجے پر ہاتھ رکھا اور دانی رو، رو کر بتانے لگا کہ پہلے اسے شکیل نے مارا اور پھر اس کا بھائی شکیل بھی آگیا اور وہ بھی مارنے لگا...... شاید اماں کا زخم تازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک آہ بھری۔

"ہائے میرا اوانوکھا (اکیلا) مارا گیا۔" اور تب ہی میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا..... شاید میں پوچھنا چاہتی کہ بھائی کیوں رو رہا ہے۔

"اماں.....!" اور اماں نے چولہے سے لکڑی کھینچ کر میرے بازو پر دے ماری۔ سلگتی لکڑی نے میری نازک جلد کو جلا دیا، میں چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ اس وقت جب اماں نے چولہے سے لکڑی کھینچی تھی تو استانی جی ہمارے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھیں، انہوں نے بھاگ کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"ہائے غضب زرینہ، یہ اتنی معصوم بچی کے ساتھ اتنا ظلم...... !"

اماں بیزار سی لیے تڑنگے دانی کو گود میں سمائے بیٹھی رہیں اور استانی جی نے شانو سے کہہ کر کچا آلو چھیل کر میرے بازو پر لگایا۔ میں ان کی گود میں سسکتی رہی...... استانی جی نے تاسف بھری نظروں سے اماں کو دیکھا۔

"اگر پیار و محبت سے اولاد کو پال نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟" استانی جی کو بہت غصہ آ رہا تھا۔

"چار تھوڑی تھیں میری جان کو مجھے کب شوق تھا استانی جی اس کا، میں نے تو اللہ سے دانی کے لیے بھائی مانگا تھا۔ یہ ٹپک پڑی۔" اماں کے دل کی بات زبان پر آگئی تھی۔

اگرچہ میری عمر صرف چھ سال کی تھی لیکن مجھے اس دن کا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ شاید اس لیے کہ استانی جی اکثر اس دن کی بات دہراتی رہتیں..... تبھی وہ میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی---- اماں، ابا کے گھر کی یہ آخری یاد تھی اس لیے کہ اسی روز استانی جی نے مجھے اماں سے مانگ لیا تھا۔ میں نے اکثر سوچا کہ جب اس گھر میں میری کسی کو چاہ نہیں تھی تو پھر اللہ میاں نے مجھے اس گھر میں کیوں پیدا کیا تھا وہ مجھے کہیں کسی اور گھر میں بھی تو پیدا کر سکتا تھا...... استانی جی نے مجھے اماں سے مانگا تھا اس لیے نہیں کہ وہ بے اولاد تھیں...... بلکہ اس لیے کہ انہیں مجھ پر ترس آ گیا تھا۔ ورنہ ان کے تین بیٹے تو پہلے سے ہی تھے۔

"لے جاؤ جی....." اماں ابھی تک دانی کے بال سہلا رہی تھیں اور انہوں نے اتنی بے پروائی سے کہا تھا جیسے میں کوئی شے تھی، جیتی جاگتی انسان نہیں اور جیسے میری پیدائش پر اماں نے کوئی تکلیف نہیں سہی ہوگی۔ یہ بات بھی استانی جی نے کتنی بار ہی دہرائی تھی۔ سو حافظے میں اسی طرح موجود ہے۔ انہی الفاظ کے ساتھ۔

"اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی زرینہ، تو فکر نہ کرنا۔" استانی جی اپنی طرف سے اماں کو تسلی دے رہی تھیں لیکن اماں کو بھلا اس کی پروا کیا ہو سکتی تھی کہ

وہ مجھے اچھی طرح رکھیں گی یا بُری طرح...... میں تو تھی ہی بے طلب...... ان چاہی...... انہیں اگر فکر تھی تو صرف یہ کہ برادری والے کہیں باتیں نہ بنائیں کہ اپنی بیٹی بھاری پڑ گئی تو دوسروں کو دے دی...... پھر بھی انہوں نے استانی جی سے وعدہ کرلیا کہ وہ میرے ابا سے بات کریں گی اگر ابا نے اجازت دے دی تو بھلے استانی جی لے جائیں...... ابا نے اماں کی بات سن کر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"ارے پانچ بیٹیاں ہیں تو کیا...... ہم انہیں بانٹنے لگیں......؟"

"یہ دیکھو گلی پیچھے ہی تو استانی جی کا گھر ہے، شانو کے ابا...... بہت پیار کرتی ہیں وہ اپنی بالی سے...... ان کے پاس رہے گی تو پڑھ لکھ بھی جائے گی...... دیکھتے نہیں ہو کتنا شوق ہے اسے پڑھنے کا، کوئلے سے دیواریں کالی کرتی رہتی ہے، دانی کی کتابیں اور کاپیاں اٹھائے پھرتی ہے۔"

"سوچ لے، زرینہ شریک باتیں کریں گے۔"

ابا کو بھی اماں: بالی فکر دامن گیر ہو گئی تھی۔

"شریکوں کی پروا کرتی ہے میری جوتی۔"

اماں فیصلہ کرچکی تھیں تو ابا بھلا کیا کرتے۔ اس روز پہلی اور شاید آخری بار ابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر غور سے دیکھا۔

"تو استانی جی کے ساتھ ان کے گھر جائے گی؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

"اچھا اگر اُدھر دل نہ لگا تو گھر آ جانا۔"

میں نے پھر سر ہلا دیا اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ مجھے ہمیشہ کے لیے اس گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ میں اس گھر میں کسی کو مطلوب نہیں تھی۔

ابا کی دو انگلیوں نے پہلی بار نرمی سے میرے رخسار کو چھوا۔ ابا کی انگلیوں کا کھردرا لمس آج بھی کبھی کبھی مجھے اپنے رخسار پر محسوس ہوتا ہے اور میں کتنی ہی دیر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس

لمس کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔

جس روز استانی جی مجھے لینے آئی تھیں، میری چاروں بہنیں اور اکلوتا بھائی قطار بنا کر کھڑے مجھے جاتے ہوئے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کبھی، کبھی صحن میں کھڑے ہو کر کبھی کبھار گزرنے والے جہاز کو دیکھتے تھے، حیرت سے اور خوشی سے...... پتا نہیں ان کی آنکھوں میں حیرت بھری خوشی تھی یا حیرت بھرا دکھ...... لیکن وہ سب اس وقت تک صحن میں کھڑے رہے جب تک میں دروازے سے باہر نہ نکل گئی......

اور ابھی ہم اپنی گلی میں ہی تھے کہ عاشو دوڑتی ہوئی آئی تھی اس کے ہاتھ میں کپڑے کی چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔

"استانی جی استانی جی......"

استانی جی رک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"یہ بالی کے کپڑے اماں نے دیے ہیں۔"

میں نے حیرت سے عاشو کی طرف دیکھا تھا۔ بھلا اماں نے میرے کپڑے کیوں بھیج دیے ہیں لیکن میرے ننھے سے دماغ میں یہ بات نہیں آسکی تھی کہ اس گھر سے میرا رابطہ ختم ہو رہا ہے۔ استانی جی نے گٹھڑی پکڑ لی تو عاشو کے جی میں پتا نہیں کیا آئی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس پر پیار کیا اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔ میں جب اس منظر کو سوچتی ہوں تو میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر عاشو کے گیلے، گیلے ہونٹوں کا لمس جاگ اٹھتا ہے اور میرا دل جیسے پگھل کر پانی ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں...... کبھی، کبھی تو میرا جی چاہتا ہے چیخیں مار، مار کر روؤں...... اور ایسے میں خود ہی اپنے ہاتھ کی پشت کو چوم، چوم کر تھک جاتی ہوں۔

استانی جی میانے ہزارے کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھیں اور ان کے شوہر آرمی میں صوبیدار تھے اور چھٹیوں میں ہی گھر آتے تھے۔ استانی جی کا گھر ہمارے گھر سے صرف ایک گلی کے فاصلے پر تھا۔ جس وقت میں استانی جی کی انگلی پکڑے اپنے گھر

کے دروازے سے نکلی تھی تو مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ ایک گلی کا فاصلہ میرے لیے اتنا طویل ہو جائے گا کہ میں اسے کبھی طے نہیں کر پاؤں گی۔ استانی جی نے گھر لاتے ہی سب سے پہلے میرے بازو کی طرف توجہ دی تھی......اور بڑے بیٹے کو دوائیوں والی دکان پر بھیج کر مرہم منگوا کر میرے بازو پر لگایا تھا جس میں اب بھی جلن ہو رہی تھی...... جب رات ہوئی تو میں نے سوچا ابھی استانی جی مجھے گھر چھوڑ آئیں گی لیکن استانی جی نے مجھے کمرے میں سونے کے لیے کہا۔

اس کمرے میں تین چارپائیاں تھیں ایک پر استانی جی سو رہی تھیں اور ایک پر انہوں نے مجھے سلایا تھا۔ جبکہ تیسری چارپائی پر ان کا چھوٹا بیٹا سو رہا تھا جو مجھ سے تھوڑا سا بڑا ہوگا...... بعد میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سات سال کا ہے اور تھری کلاس میں پڑھتا ہے۔ دونوں بڑے بیٹے ساتھ والے کمرے میں سو رہے تھے۔ میں چپ چاپ لیٹ گئی تھی لیکن میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں دوڑتی ہوئی اپنے گھر چلی جاؤں اور چپکے سے جا کر عاشو یا شانو کی چارپائی پر ان سے چمٹ کر سو جاؤں۔ گھر میں اکیلی تو میں کبھی نہیں سوئی تھی۔ اپنی چاروں بہنوں میں سے کسی ایک کے پاس سو جاتی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ جب استانی جی لالٹین بجھانے کے لیے اٹھیں تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

''سو جاؤ گڑیا......'' اور پھر ان کی نظر شاید میری بھری ہوئی آنکھوں پر پڑی تھی۔

''کیا بازو میں جلن ہو رہی ہے...... درد تو نہیں ہو رہا؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ کاش وہ پوچھتیں کہ اماں، ابا یاد آ رہے ہیں یا گھر اور بہنیں یاد آ رہی ہیں تو میں فوراً کہتی ہاں...... اور پھر شاید زندگی مختلف ہوتی میں سویرا اقبال کے بجائے صرف اقبال ہوتی...... دین محمد زمیندار کی بیٹی......

شاید میں سویرا اقبال کی طرح کامیاب عورت نہ ہوتی لیکن سویرا اقبال سے زیادہ مطمئن ہوتی......

لیکن استانی جی نے ایسا کچھ نہیں پوچھا تھا اور میں خود سے انہیں نہیں کہہ سکی تھی کہ مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے' مجھے واپس بھجوا دیں، بھلے میں وہاں مطلوب نہیں تھی، اماں، ابا نے میرے ہونے کی دعائیں نہیں مانگی تھیں لیکن وہ میرا اپنا گھر تھا اور استانی جی کا گھر میرا نہیں تھا...... میں آس بھری نظروں سے استانی جی کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید اب، شاید اب وہ پوچھیں...... لیکن انہوں نے کارنس سے لالٹین اتار کر اس کی لو نیچی کی پھر اس کا شیشہ اونچا کر کے پھونک ماری...... کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ ان دنوں میانے ہزارے میں بجلی نہیں تھی۔ پتا نہیں اب ہو...... یا ہو سکتا ہے نہ ہو......

کمرے میں اندھیرا ہو گیا تو میں بے آواز رونے لگی اور پھر روتے روتے سو گئی۔

استانی جی نے اگلے دن بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ کیا مجھے گھر واپس جانا ہے، بہن، بھائی تو نہیں یاد آ رہے...... بلکہ انہوں نے کبھی نہیں پوچھا۔ انہوں نے بھی شاید مجھے کوئی چیز ہی سمجھا تھا جیسا کہ وہ دوسروں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا کرتی تھیں۔

''اس کی ماں نے تو اسے یوں میری جھولی میں ڈال دیا جیسے اس نے درد نہیں سہے تھے۔ جیسے یہ کوئی چیز تھی اور اس نے نو ماہ پیٹ میں نہیں رکھا اس کا بوجھ نہیں اٹھایا......'' آخر اماں اور استانی جی میں فرق ہی کیا تھا۔ انہوں نے بھی تو کبھی نہیں پوچھا۔

''کیا تمہیں اپنے سنگ کھیلنے والی بہنیں یاد آتی ہیں؟ وہ اکلوتا بھائی لاڈلا بھائی...... ابا، اماں......''

استانی جی کئی دن تک میرے بازو پر مرہم لگاتی رہیں۔ میرا زخم ٹھیک ہو گیا۔ حتیٰ کہ جلنے کا داغ بھی نہیں رہا لیکن دل پر جو آبلے پڑے تھے وہ آج تک خون برستے ہیں اور وہ اسی طرح تکلیف دیتے ہیں۔

مجھے استانی جی کے گھر آئے تیسرا دن تھا۔

جب استانی جی کے شوہر چھٹی پر گھر آئے تھے اور استانی جی نے میرا بازو پکڑ کر انہیں دکھایا تھا۔

''ایسی ظالم ماں جلتی لکڑی دے مارے معصوم بچی کو...... میں تو لے آئی اسے کہ مجھے دے دو...... ہمیں ایک بچی بھاری نہیں ہے جہاں تین پل رہے ہیں وہاں یہ بھی پل جائے گی۔''

''ہاں اچھا کیا۔۔۔۔ ویسے بھی تمہیں بیٹی کا شوق تھا۔ پورا ہو جائے گا۔'' صوبیدار انکل کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

استانی جی کے شوہر جنہیں میں بعد میں انکل کہنے لگی تھی۔ دو تین دن کی چھٹی پر گھر آئے تھے اور ان کے آنے کے بعد استانی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ابرار اور میں کمرے میں اکیلے تھے۔

رات کو جب استانی جی لالٹین بجھا کر چلی گئیں تو میں چپکے، چپکے رونے لگی۔۔۔۔ تب ابرار جسے استانی جی اور اس کے دونوں بڑے بھائی باری کہتے تھے۔ اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔۔۔۔ باہر برآمدے میں جلتی ہوئی لالٹین کی مدھم، مدھم سی روشنی اندر کمرے میں بھی آ رہی تھی۔

''تم کیوں رو رہی ہو گڑیا......؟'' میں نے جواب نہیں دیا تو وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر میری... چارپائی کے قریب آ گیا۔

''ڈر لگ رہا ہے؟''

میں اور زیادہ رونے لگی۔

''ڈرو نہیں......'' اس نے مجھے تسلی دی۔

''میں ہوں ناں اِدھر...... اور تمہیں آیت الکرسی آتی ہے؟''

''نہیں......'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے آتی ہے...... اماں کہتی ہیں آیت الکرسی پڑھ کر سوئیں تو پھر ڈر نہیں لگتا...... میں پڑھ کر پھونک دیتا ہوں۔''

اور یہ باری سے میری دوستی کی ابتدا تھی۔

میرے آنسو تھم گئے تھے۔ وہ کچھ دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی عمر سات سال ہے۔

استانی جی انکل کے آنے سے تھوڑی مصروف ہو گئی تھیں۔ میں برآمدے میں بیٹھی رہتی۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ گھر چلی جاؤں۔ اماں نے کہا تھا کہ جی نہ لگے تو آ جانا...... لیکن پتا نہیں کیوں میں وہ ایک گلی پار نہ کر سکی...... بس منتظر رہی کہ کوئی مجھے لینے آئے...... لیکن کوئی نہیں آیا...... پتا نہیں میری گھٹی میں ہی انا اور خودداری تھی کہ میں خود نہیں گئی۔

انکل واپس چلے گئے تو استانی جی نے میرا یونیفارم سلوایا۔ نیلا فراک، سفید شلوار اور کالے بوٹ پہن کر جب میں پہلے دن استانی جی کے ساتھ اسکول گئی تو مجھے بہت اچھا لگا۔ اپنا آپ بھی اور اسکول جانا بھی...... استانی جی نے مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا تھا...... میرا بڑا جی چاہ رہا تھا کہ میری بہنوں میں سے کوئی آ جائے تو میں انہیں اپنا یونیفارم دکھاؤں اور شانو، عاشو دونوں ہی اسی روز استانی جی کے گھر آئی تھیں اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ سب نانی سے ملنے چنیوٹ گئے ہوئے تھے۔ کیا تھا اگر وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میں اپنے ہوش میں کبھی نانی کے گھر نہیں گئی تھی۔ میرے دل میں جیسے ایک اور آبلہ پڑ گیا تھا۔ میں نے شانو اور عاشو کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بس چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔ شانو نے مجھے بتایا کہ نانی نے اماں کو بہت ڈانٹا ہے کہ انہوں نے مجھے استانی جی کے ساتھ کیوں جانے دیا۔

''تو گھر چلے گی بالی؟'' عاشو نے مجھ سے کہا تو میں استانی جی کی طرف دیکھنے لگی۔

''نہ بھائی بھول جاؤ اسے...... یہ تو اب میری بیٹی ہے۔ تمہاری اماں نے اسے مجھے دے دیا ہے۔''

میں نیچے دیکھنے لگی اور کہہ نہ سکی کہ نہیں میں

اپنے اماں، ابا کی بیٹی ہوں اور مجھے گھر جانا ہے اور میں کبھی دل کی کوئی بات نہیں کہہ سکی تھی۔ کبھی اماں سے نہ کہہ سکی کہ مجھے اپنی گود میں لٹالیں...... کبھی ابا سے نہیں کہا کہ مجھے بھی انگلی پکڑ کر بازار لے جائیں۔ بس ٹکر ٹکر انہیں دیکھا کرتی اور دل میں خواہش اور لفظ گھٹتے رہتے۔

شانو، عاشو اور دوسری بہنیں کبھی، کبھی مجھے ملنے آتی تھیں۔ عاشو نے ایک روز مجھ سے کہا تھا۔

"بالی چل گھر، میں نے تیرے لیے کپڑے کی اتنی اچھی گڑیا بنائی ہے اور اماں کے پراندے سے دھاگے نکال کر اس کے بال بھی بنائے ہیں...... اور آنکھیں بھی۔"

میرا بڑا جی چاہا کہ عاشو کے ساتھ گھر چلی جاؤں۔ اماں، ابا سب کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اماں شاید چولھے پر ہانڈی چڑھائے بیٹھی ہوں مجھے اتنے دنوں بعد دیکھ کر ضرور مجھے گلے لگا کر چوم لیں گی اور کہیں گی بس اب تو نے نہیں جانا...... میں نے چپکے، چپکے استانی جی کی طرف دیکھا جو میری تختی پر اکرے (نقطے) ڈال رہی تھیں۔ جن پر مجھے سیاہی اور قلم پھیرنا تھا...... اور مجھے یاد آیا استانی جی کہتی ہیں کہ مجھے اماں نے انہیں دے دیا ہے اور اگر میں چلی گئی عاشو کے ساتھ تو استانی جی تو ضرور کہیں گی اماں نے تھوک کر چاٹ لیا ہے پھر تو اماں کی بہت بے عزتی ہوگی۔ پہلے ہی استانی جی اماں کو قصاب اور ظالم کہتی ہیں...... تو میں عاشو کے ساتھ نہیں گئی......

جب میں نیلی فراک سفید شلوار اور کالے بوٹ پہن کر اسکول جاتی تو مجھے لگتا جیسے میں عاشو، پجو سب سے مختلف ہوں۔ جیسے میرے پر لگ گئے ہوں۔

استانی جی مجھے اپنے ساتھ اسکول لے کر جاتی تھیں اور ساتھ ہی واپس لاتی تھیں...... اپنے گھر والی گلی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم سست پڑ جاتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں استانی جی کا ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی اپنی گلی میں چلی جاؤں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں...... لیکن میں کبھی ایسا نہیں کر سکی۔ ہاں میری آنکھیں ضرور اپنی گلی کی طرف نگراں ہو جاتیں...... استانی جی کی زندگی میں اور گھر میں بڑی ترتیب تھی۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ترتیب سے ہوتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر استانی جی ہمیں قرآن پاک پڑھاتیں، بڑے دونوں بھائی خود ہی پڑھ لیتے پھر ناشتا، ناشتے کے بعد اسکول، اسکول سے آکر کھانا اور پھر آرام کرنا شام کو پھر اسکول کی پڑھائی...... لیکن مجھے اماں کے گھر کی...... بے ترتیبی یاد آتی۔ جب جی چاہا کھیلا...... جب جی چاہا لیٹ گئے۔ دوپہر میں پجو اور فرو گڑیا لے کر بیٹھ جاتیں...... عاشو اور شانو ان کے کپڑوں پر ستارے ٹانک دیتیں۔ میں بھی پاس بیٹھ کر دیکھتی۔ کبھی صحن میں سب مل کر کھیلتیں۔ اشکی ڈالتیں، چھپن چھپائی چھل دوج اور ڈھیروں کھیل تھے...... اماں چارپائی سیدھی کھڑی کر کے گرمیوں کی دوپہروں میں اس پر ازار بند بنتیں...... ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے بانس کی تیلیوں پر چلتے تھے۔ کوئی تیلیاں لگاتیں، کوئی نکالتیں، ڈیزائن بنتا جاتا۔ ایک بار میں نے تیلیاں کھینچ دی تھیں تو اماں نے مجھے کئی تھپڑ لگائے تھے۔

اماں کا پیار تو مجھے یاد نہیں تھا لیکن ان کی مار بھی مجھے یاد آتی تھی۔ مجھے اپنا گھر بھی یاد آتا تھا۔ جس کے صحن کے ایک کونے میں اپلوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا، سوکھنے کے لیے اور ایک کونے میں لکڑیاں ہوتی تھیں جو ابا...... ٹال سے اکٹھی لے کر آتے تھے اور جب بھی بادل آتے اور بارش شروع ہوتی تو سب بہنیں اور بھائی بھاگ، بھاگ کر یہ لکڑیاں اور اُپلے چھپر تلے رکھتے...... استانی جی کے ہاں مٹی کے تیل کا چولھا تھا جو برآمدے میں ایک کونے میں پڑا رہتا...... پاس ہی مٹی کے تیل کا کنستر تھا جس میں سے بمبو (پمپ) سے تیل نکال کر بوتل میں ڈالا جاتا اور کیف رکھ کر

چولہے میں۔ صحن میں ایک طرف مٹی کا چولہا بھی تھا لیکن استانی جی اس چولہے پر صرف پانی گرم کرتی تھیں۔ اماں کے گھر کی بے ترتیبی میں بھی کتنا حسن اور خوب صورتی تھی۔ گرمیوں میں جب شام کے وقت اماں تندور جلا کر روٹیاں لگاتی تھیں تو میں پاس کھڑی انہیں دیکھا کرتی تھی پورے صحن میں گرم، گرم روٹی کی سوندھی، سوندھی خوشبو پھیل جاتی تھی۔ اماں کے گھر جب بھوک لگتی تھی شانو، عاشو چنگیری میں پڑی بچی روٹی پر اچار رکھ کر کھا لیتی تھیں لیکن استانی جی کے گھر میں کسی کو بے وقت کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ انصار اور ابصار بھائی تو ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے لیکن باری میرے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس نے اپنے سارے کھلونے مجھے دکھائے تھے۔ وہ عمر میں تو مجھ سے ایک سال ہی بڑا تھا لیکن پڑھائی کے لحاظ سے دو سال آگے تھا۔ میں سبق بھی یاد کر لیتی، کھیل بھی لیتی اور پھر بھی جیسے سارا دن میں فارغ بس استانی جی کے گھر کے برآمدوں اور کمروں میں گھومتی پھرتی...... کبھی بار دروازہ کھول کر دیکھتی...... بس ایک گلی کا فاصلہ اور...... شروع میں شانو، عاشو، فرو تو کبھی کبھی آجاتی تھیں، تھوڑی دیر کے لیے لیکن اماں نہ جانے کیوں نہیں آتی تھیں...... دانی کو بھی میں کبھی، کبھی اسکول سے آتے جاتے گلی میں دیکھ لیتی تھی لیکن اماں، ابا نہیں ملتے تھے۔ حالانکہ عاشو یا شانو جب بھی آتیں ضرور پوچھتی تھیں کہ مجھے گھر تو نہیں جانا اور اگر کبھی استانی جی سن لیتیں تو ضرور یاد کرواتیں کہ اب میں ان کی بیٹی ہوں...... حالانکہ انہوں نے مجھے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں انہیں استانی جی نہ کہوں باری اور انصار، ابصار کی طرح امی کہوں...... نہ ہی مجھے یہ کہا کہ صوبیدار انکل کو ابو کہو۔ یوں میں ہمیشہ ہی انہیں استانی جی اور انکل کہتی رہی...... میں پہلی سے دوسری میں آگئی۔ بہنوں کا آنا کم ہوتے، ہوتے ختم ہو گیا

لیکن شاید میرے گھر سے آنے کے بعد اماں نے پھر دانی کے لیے جوڑے کی خواہش دل میں پال لی تھی کہ ایک دن بڑے دنوں بعد فرو آئی تو اس نے استانی جی کو بتایا کہ ان کے گھر بھائی آیا ہے۔

"اماں بہت خوش ہوں گی کہ اب دانی کلا (اکیلا) نہیں رہا تھا۔" میں نے سوچا تھا۔ میرا دل اسے دیکھنے کو چاہ رہا تھا اور میں بار، بار فرو کو دیکھتی تھی کہ وہ مجھے ساتھ لے جائے گی۔ بھائی دکھانے کے لیے لیکن وہ تو استانی کو بتاشے دے کر چلی گئی تھی۔ اسے اور گھروں میں بھی بتاشے بانٹنے تھے۔ اس روز استانی جی بھائی کی مبارک باد دینے گئیں تو مجھے ساتھ لے گئیں...... اور میں اپنے ہی گھر کو حیرت سے تکتی رہی۔ بڑے سے صحن کے کونے میں رکھے اپلوں کے ڈھیر کو چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کو شانو صحن میں چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی...... دونوں گھروں میں زندگی کتنی مختلف تھی۔ استانی جی کے ساتھ میں اماں کے پاس کمرے میں آئی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹی تھیں اور ان کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا...... عاشو ان کی چارپائی پر بیٹھی ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ دوسری چارپائی پر فرو منے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اماں نے ہمیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

"ارے، ارے لیٹی رہو زرینہ......" استانی جی نے کہا تھا لیکن اماں پھر بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے وہم سا ہوا تھا کہ میری طرف دیکھتے ہوئے اماں کی آنکھوں میں نمی تھی اور انہوں نے بے اختیار ہاتھ آگے کیے تھے اور پھر پیچھے کر لیے تھے۔ میں دوڑ کر اماں سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ ان کی گود میں سما جانا چاہتی تھی لیکن اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس روز استانی جی نے مجھے گلابی جالی کا پھولا پھولا سا فراک پہنایا تھا جو صوبیدار انکل شہر سے میرے لیے لائے تھے۔ میں نے سفید جرابیں اور سفید ہی شوز پہن رکھے تھے۔ شاید استانی جی مجھے یہ

نئے کپڑے اس لیے پہنا کر لے گئی تھیں کہ اماں کو لگے کہ میں اس گھر کے مقابلے میں اُس گھر میں زیادہ اچھی طرح اور زیادہ خوش ہوں...... اچھی طرح تو تھی لیکن میں زیادہ خوش نہیں تھی اور یہ بات صرف میں جانتی تھی اور میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ میں کبھی وہ بات نہ کہہ پاتی تھی جو میرے دل میں ہوتی تھی۔

میری بہنیں مجھے حیرت اور رشک سے دیکھتی تھیں اور مجھے اپنا آپ اس گھر میں بہت اجنبی، اجنبی سا لگتا تھا...... فرو نے مجھے بھائی دکھانے کے لیے بلالیا تھا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا اور آنکھیں بھینچے سو رہا تھا۔ میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر فوراً اٹھا لیا تھا۔ فرو نے کہا تھا۔

"ہائے باجی تو تو بالکل شہری کڑی لگ رہی ہے۔" میں چپ، چاپ نگاہیں جھکائے بھائی کو دیکھتی رہی تھی۔ جیسے مجھے بولنا نہیں آتا تھا اور مجھے واقعی بولنا نہیں آتا تھا جب استانی جی جا رہی تھیں تو میرا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا...... میں نے کئی بار الفاظ ترتیب دے کر کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ نہ کہہ سکی...... اور بے بسی سے فرو کو دیکھنے لگی۔

"تھوڑی دیر اور رک جائیں استانی جی، شانو کے ابا آتے ہوں گے وہ بھی باجی سے مل لیں گے۔ یاد کرتے ہیں۔" اماں لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

مجھے اماں کی بات کا یقین نہیں آیا تھا اگر ابا مجھے یاد کرتے تو ایک گلی کا فاصلہ اتنا طویل تو نہیں تھا کہ استانی جی کے گھر تک نہ آسکتے۔ اماں اب، ہولے، ہولے کچھ کہہ رہی تھیں میں پھر منے کو دیکھنے لگی۔

"اماں بہت بیمار ہوگئی تھیں باجی...... بس مرتے، مرتے بچی ہیں۔" فرو نے مجھے بتایا تھا میں نے مڑ کر اماں کو دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھیں یا شاید فرو...... فرو کو ہی دیکھ رہی ہوں گی۔

"نام کیا رکھا ہے؟" اب استانی جی نے پوچھا تھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں رکھا...... آپ بتائیں ناں اچھا سا نام جو دانیال سے ملتا جلتا ہو۔" اماں کی آنکھیں یک دم لو دینے لگی تھیں، میں نے نظریں ان کے چہرے سے ہٹالیں۔

میرا نام اماں نے اقبال رکھا تھا۔ اب سوچتی ہوں شاید اماں نے پہلے سے ہی دانیال کے ساتھ ملا کر سوچ رکھا ہوگا لیکن جب میں آگئی تو اماں نے میرا ہی نام اقبال رکھ دیا...... لیکن جب استانی نے مجھے اسکول داخل کروایا تھا اور میونسپل کمیٹی سے میرا پیدائش کا سرٹیفکیٹ نکلوایا تھا تو اس میں میرا نام سویرا اقبال لکھا ہوا تھا۔ سو میرا پورا نام سویرا اقبال تھا۔

ضرور سویرا نام کا سابقہ شانو یا عاشو نے میرے نام کے ساتھ لگایا ہوگا اور ابا سے کہا ہوگا کہ یہی نام لکھوائیں۔ خود ان کے بھی تو دو، دو نام تھے۔ عاشو کا عائشہ نسیم، شانو کا رخسانہ جبیں، پنو کا پروین اختر اور فرو کا فریدہ زرین...... اس روز استانی جی ابا کے آنے تک رکی تھیں۔ ابا منہ ہاتھ دھو کر باہر برآمدے میں ہی چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔ فرو میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لائی تھی۔

"ابا دیکھیں کون آیا ہے۔"

ابا کی آنکھیں کچھ دیر کو میرے چہرے پر ٹک گئی تھیں۔

"کیا ابا میری شکل بھول گئے ہیں؟"

"ادھر آ باجی......" ابا حیرت کے سمندر سے باہر آئے تھے۔ "تو ٹھیک ہے ناں...... خوش ہے ناں......"

میں نے سر ہلا دیا تھا۔

"جی تو نہیں گھبراتا...... گھبرائے تو گھر واپس آجانا۔" ابا نے اسی روز والی بات دُہرائی تھی اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے پھر وہم ہوا تھا جیسے ابا کی آنکھیں پُرنم ہوں اور ان کا ہاتھ لرز رہا ہو۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں کہوں ہاں میرا جی گھبراتا ہے، ابا مجھے گھر آنا ہے، مجھے نہیں جانا...... لیکن میں ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ کاش میں رو ہی پڑتی، ابا سے لپٹ جاتی لیکن...... میں تو یہ بھی

نہیں کر سکتی تھی۔ پنو کو کوئی بات اماں سے منوانی ہوتی تھی تو چیخ، چیخ کر روتی تھی۔ زمین پر لیٹ کر لاتیں چلاتی، مچل، مچل کر روتی...... کاش جب استانی جی مجھے لینے آئی تھیں تو میں بھی زمین پر لیٹ جاتی۔ مچل، مچل کر پاؤں رگڑ، رگڑ کر روتی اور ابا، اماں استانی جی کو منع کر دیتے لیکن نہ میں اس روز ایسا کر سکی تھی نہ اب اور استانی جی کے ساتھ ان کے گھر آ گئی تھی۔

اس روز میں نے باری سے بھی بات نہیں کی تھی اور چپکے سے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی تھی۔ حالانکہ باری نے کہا بھی تھا کہ لوڈو کھیلتے ہیں لیکن میں سوتی بن گئی تھی مجھے بہت رونا آ رہا تھا اور پھر جب میں نے دوسری پاس کر لی تھی تو انصار بھائی بھی ساتویں پاس کر کے آٹھویں میں آ گئے تھے اور صوبیدار انکل چاہتے تھے کہ اب وہ شہر کے کسی اچھے اسکول میں پڑھے۔ چنانچہ استانی جی کھاریاں جانے کی تیاریاں کرنے لگی تھیں اور میں نے باری سے پوچھا تھا۔ "اب تم سب لوگ شہر میں رہو گے؟"

تب باری نے مجھے بتایا تھا۔

"ہاں...... اور تم بھی تو ہمارے ساتھ جاؤ گی...... تمہاری اماں نے تمہیں میری امی کو جو دے دیا ہے۔"

اور میرا دل جیسے ڈوب گیا تھا۔ میری اماں، ابا شانو، عاشو، پنو، فرو، دانی اور چھوٹا جمال جانے سے ایک دن پہلے استانی جی مجھے سب سے ملوانے کے لیے لے گئی تھیں۔ اس روز بھی انہوں نے مجھے عید والی نئی فراک پہنائی تھی۔

"ہم لوگ کھاریاں جا رہے ہیں تاکہ بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا سکیں۔ یوں تو آپ نے ہالی مجھے دے دی ہے پھر بھی آپ کی چیز ہے سوچا آپ سے اجازت لے لوں...... یہ آپ کی امانت ہے جب کہیں گے لے آؤں گی۔"

"استانی جی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ...... اب تو یہ آپ کی بیٹی ہے۔" اماں، استانی جی سے بات کرتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"پھر بھی بیٹی تو آپ کی ہی ہے ناں زرینہ بہن، میں نے سوچا پوچھ لوں یہ نہ کہیں کہ ہماری بیٹی کو لے کر غائب ہو گئے۔" استانی جی مسکرائیں۔

"خوشی، غمی، عید، بقر عید تو اپنے گاؤں میں کریں گے ناں آپ لوگ؟" اماں کی آواز میں جیسے حسرت سی تھی۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں...... عید، بقر عید تو اپنے گاؤں میں ہی کرنی ہوتی ہے۔"

میں ادھر کی تھی نہ ادھر کی......

استانی جی کی بیٹی تھی نہ اماں کی...... استانی جی کو مجھ سے ہمدردی تھی، ہمارے درمیان صرف ترس اور ہمدردی کا رشتہ تھا۔

اور اماں کو میری طلب نہیں تھی، میں بے طلب ہی ان کی جھولی میں آ گئی تھی...... مجھے محبت کی طلب تھی۔ جس کا تب مجھے ادراک نہیں تھا اور جب ادراک ہوا تو میرے اندر ناسور ہو گئے تھے کہ میں بن چاہی تھی۔ ایک اور بیٹے کی آرزو میں اماں نے مجھے جنم دیا۔ میں جو پانچویں بچی تھی اور مجھ سے پہلے چار اور بھی تھیں۔ اس لیے اماں مجھے استانی جی کو دے کر بھول گئیں۔ کھاریاں آ کر استانی جی نے مجھے اور باری کو ایک ہی اسکول میں داخل کروایا تھا۔ میں کلاس تھری میں تھی تو وہ فائیو میں...... یہاں پڑھائی تھوڑی مختلف اور مشکل تھی لیکن استانی جی نے میرے اور باری کے لیے ٹیوٹر رکھ لیا تھا۔ انصار بھائی اور ابصار بھائی بھی اکیڈمی جاتے تھے۔ میں ذہین تھی بلکہ اسکول کی ٹیچرز نے ایک بار استانی جی سے پیرنٹس میٹنگ پر کہا تھا کہ آپ کی بیٹی جینئس ہے...... اور استانی نے فوراً تردید کی تھی۔

"نہیں میم، اللہ اس کے ماں، باپ کو زندہ رکھے۔ یہ میری بیٹی نہیں ہے بلکہ ہمارے گاؤں میں

میرے بہت اچھے جاننے والے کی بیٹی ہے۔ پانچ بیٹیاں تھیں ان کی سو یہ ایک میں نے لے لی۔" ٹیچر کی تعریف پر جو میرے اندر خوشی کے چراغ جلے تھے وہ یک دم بجھ گئے۔

یہ وہ جملہ تھا جو وہ اکثر بولا کرتی تھیں۔ جب تک میں ان کے ہاں رہی اس جملے نے سیکڑوں بار مجھے زخمی کیا...... جب بھی کوئی کہتا آپ کی بیٹی بہت خوب صورت ہے، بہت پیاری ہے، ذہین ہے، جواب میں وہ اسی طرح کی یا اس سے ملتی جلتی بات کہتی تھیں۔ یوں میں نہ اماں، ابا کو بھلا پائی نہ استانی جی کو اپنا سکی۔ میں جیسے خلا میں لٹکی ہوئی تھی مگر میں زبان سے کچھ نہ کہہ پاتی حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے کہوں مجھے میرے گھر واپس چھوڑ آئیں پر میرے اندر لفظ بنتے اور بگڑتے اور پھر کہیں کھو جاتے تھے۔ میں اس گھر کی فرد ہوتے ہوئے بھی اس گھر کی فرد نہیں تھی۔ اور جس گھر کی فرد تھی انہوں نے مجھے اپنے گھر سے بے دخل کر دیا تھا...... کھاریاں، جہلم، جہلم سے راولپنڈی ہمارا قیام کئی شہروں میں رہا لیکن ہم پھر کبھی میانے ہزارے نہ گئے حالانکہ استانی جی نے اماں سے کہا تھا کہ "عید، بقر عید تو اپنے گاؤں میں ہی سجتی ہے۔ اجنبی شہروں میں کیسی عیدیں......"

اور ہر عید سے پہلے میں ایسے آس لگا کر بیٹھ جاتی تھی کہ اب استانی جی کہیں گی کہ تیاری کر لو۔ عید کرنے گاؤں جانا ہے...... لیکن ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا...... کبھی...... انصار کے امتحان نزدیک ہوتے، کبھی ابصار کے، کبھی صوبیدار انکل کی چھٹی اتنی مختصر ہوتی کہ جا نہ پاتے اور میرے اندر جو دکھوں کا شکووں کا ڈھیر لگا تھا ان میں ایک اور دکھ کا اضافہ ہو جاتا۔ پھر ان دکھوں نے لفظوں کا پیراہن پہن لیا...... میں چھٹی میں تھی جب ہماری اردو کی ٹیچر مس ربانی نے ہمیں اپنے والدین پر مضمون لکھنے کے لیے دیا...... مس ربانی ایک کہانی نگار تھیں۔ ان کی کہانیاں مختلف ادبی پرچوں میں چھپا کرتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کا علم بہت بعد میں ہوا تھا کہ وہ رائٹر ہیں۔ ان کی عادت تھی۔ وہ لڑکیوں کو آؤٹ آف کورس چیزیں بھی لکھنے کو دیا کرتی تھیں تاکہ ان کی رائٹنگ پاور بہتر ہو جائے تو اس روز جب میں لکھنے بیٹھی تو میری آنکھوں کے سامنے اماں اور ابا آ گئے تھے۔ میں نے لکھا...... میری اماں کو نہ میری طلب تھی نہ چاہ...... مجھے نہیں علم کہ میری اماں کی جب پہلی نظر مجھ پر پڑی ہو گی تو اس نظر میں میرے لیے کیا تھا' محبت یا نفرت...... میرا خیال ہے نفرت...... ناراضی' غصہ...... میرے اندر جے لفظ جیسے پگھل، پگھل کر صفحے پر گر رہے تھے...... اگلے روز مس ربانی نے میری کاپی دیکھی اور پھر اپنے پاس ہی ٹیبل پر رکھ لی تھی۔ باقی لڑکیوں کی کاپیاں انہوں نے واپس کر دی تھیں۔ میں نے ڈرتے، ڈرتے ان سے کاپی مانگی......

انہوں نے بغور مجھے دیکھا۔

"تمہارا مضمون کافی لمبا ہے...... بریک میں آفس میں آنا۔"

اس روز میرے اور مس ربانی کے درمیان ایک ایسے تعلق کی بنیاد پڑی تھی جو آج تک نہیں ٹوٹا...... اس روز انہوں نے میری انگلی تھام کر میری رہنمائی کا فریضہ سنبھال لیا تھا۔

"یہ تم نے خود لکھا ہے یا کہیں سے نقل کیا ہے؟"

"میں نے خود لکھا ہے۔"

میری آنکھوں میں میانے ہزارے سے آنے کے بعد پہلی بار آنسو آئے تھے۔

"میرے پاس اپنے والدین پر لکھنے کے لیے یہی کچھ تھا۔" اس روز استانی جی والی ڈیوٹی میں نے سنبھالی تھی اور مس ربانی کو وہی بتایا تھا جو استانی جی دوسروں کو بتاتی تھیں۔

"تمہاری تحریر بہت خوب صورت ہے، میرا

دل کہتا ہے تم ایک دن بہت بڑی رائٹر بنو گی۔" وہ مسکرائی تھیں۔

پھر انہوں نے مجھے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کو دیں۔ وہ اخبار میں سے بچوں کا صفحہ میرے لیے لے کر آتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہانی لکھنے پر اکسایا...... اور چھٹی جماعت میں ہی میں نے بچوں کے لیے کہانی لکھی اور مس ربانی کو دی جو انہوں نے بچوں کے ایک میگزین میں چھپوا دی۔ یوں یہ سلسلہ چل پڑا...... پھر میں نے ساتویں میں نظم لکھی...... مائی مدر......

مس ربانی نے اس کی تصحیح کر کے چھپوا دیا۔ پھر میں نے اردو میں بھی نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ مس ربانی نے ہر، ہر لمحہ مجھے گائیڈ کیا۔ میٹرک تک یہ راز صرف میرے اور مس ربانی کے درمیان رہا۔ میں نے باری کو بھی اس کے متعلق نہیں بتایا۔ جس کے ساتھ میں اب اکثر باتیں شیئر کرنے لگی تھی لیکن اب بھی زیادہ وہ ہی بولتا تھا، میں تو صرف سنتی تھی......

میں جب نائنتھ میں آئی تو وہ میٹرک کر کے کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ یوں اسکول کا ساتھ چھوٹ چکا تھا۔ اس نے میٹرک تک اسی اسکول میں پڑھا تھا جس میں ابھی میں پڑھ رہی تھی...... میں نے میٹرک میں پہلی غزل کہی...... وہ کوئی خاص تو نہیں تھی اور اس کے ایک دو مصرعے بے وزن تھے لیکن ایک بار پھر مس ربانی میری راہبر بن گئی تھیں۔

انہوں نے میری غزلوں کی اصلاح کی اور وہ ادبی پرچوں میں ان کے توسط سے چھپنے لگیں تو جب میں میٹرک میں تھی تو میں نے باری کو بھی اس راز میں شریک کر لیا تھا...... باری کو یقین نہیں آتا تھا۔

"یہ تم نہیں ہو سکتیں ویرا......" یہاں اس گھر میں مجھے بالی کے بجائے سب سے پہلے باری نے ہی ویرا کہنا شروع کیا تھا اور پھر سب ہی ویرا کہنے لگے تھے۔

"یہ میں ہوں، لیکن تم استانی جی کو مت بتانا......"

"اچھا اس جیسا ایک مصرعہ کہو۔ میرا مطلب ہے مصرعۂ طرح میں دیتا ہوں۔

ابھی، ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا"

"جدائیوں میں تو پل بھر گزرنا مشکل ہے
ابھی، ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا
جو شاخ جھک نہیں سکتی وہ ٹوٹ جاتی ہے
سنبھل کے ہاتھ بڑھانا اگر جھکانا ہوا"

"گریٹ...... مجھے یقین نہیں آ رہا...... ٹیچرز تمہارے متعلق صحیح کہتی تھیں کہ تم جینئس ہو۔" اس روز اس نے میری اب تک کی چھپی ہر چیز دیکھی اور پڑھی تھی...... اور مجھے بے اندازہ سراہا تھا۔

اس روز پہلی بار مجھے اپنا آپ تھوڑا معتبر لگا تھا اور مجھے مس ربانی کی بات سچ لگی تھی کہ اللہ اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے۔ اگر میں وہاں ہی ہوتی میانے ہزارے میں اپنی اماں کے گھر تو شاید اس وقت میری زندگی کا رنگ مختلف ہوتا...... اور مجھے لگا جیسے دل میں چھپے دکھ کے کانٹے کی چبھن کچھ کم ہو گئی ہے...... اور میں نے سوچا جب بھی ہم میانے ہزارے جائیں گے تو اماں، ابا اور باقی سب مجھے دیکھ کر کس قدر حیران ہوں گے اور جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میرا لکھا اخباروں اور رسالوں میں چھپتا ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا لیکن تب مجھے علم نہیں تھا کہ میں اب میانے ہزارے کبھی نہیں جاؤں گی۔

جس روز انصار بھائی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی اس روز کاکول سے واپسی پر استانی جی اور صوبیدار انکل میانے ہزارے چلے گئے تھے۔ وہاں اپنا آبائی گھر اور زمین بیچ کر آئے تو سیالکوٹ میں اپنا گھر لے لیا اور باقی کی رقم بینک میں محفوظ کر دی۔ ان دنوں ہم سیالکوٹ میں رہ رہے تھے اور یہاں رہتے ہمیں پانچ سال ہو رہے تھے۔ اس لیے مستقل رہائش کے لیے بھی سیالکوٹ کو ہی منتخب کیا گیا تھا...... یوں بھی ابرار، ابصار اور میں ہم تینوں ہی یہاں کے اسکول اور کالجز میں پڑھ رہے تھے۔ ابصار کا ارادہ بھی آرمی میں

جانے کا تھا۔ البتہ ابرار نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ وہ ایف۔ ایس۔ سی کر رہا تھا۔

"تو اب میں کبھی میانے ہزارے نہیں جا سکوں گی اور کبھی اپنے ماں، باپ کا گھر دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گی......" سب کے دھندلے دھندلے سے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے......

میرے اندر سات سال سے جو آس کا دیا جل رہا تھا وہ ایک دم بھڑک کر بجھ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں دھول اڑ رہی تھی اور اندر جیسے گہرا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔

میں اس وقت اوپر چھت پر جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی مجھے استانی نے بتایا تھا کہ انہوں نے میانے ہزارے والا گھر اور زمین بیچ دی ہے اور انہوں نے بتایا تھا میرے گھر میں سب بھلے چنگے ہیں...... اور یہ کہ شانو اور عاشو دونوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ میں چڑیا کے بھوکے پیاسے بچوں کی طرح منہ اٹھائے ان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ابھی وہ بتائیں گی کہ اماں مجھے یاد کرتی تھیں...... بہنیں اداس ہیں، میرا ویر دانی اور میرے ابا بھی مجھے بہت یاد کرتے ہیں لیکن چڑیا کے بچے چونچ کھولے بیٹھے رہے اور چڑیا ان کی چونچ میں دانہ ڈالے بغیر اڑ گئی۔ استانی جی ابصار کے ساتھ مکان دیکھنے چلی گئیں۔ صوبیدار انکل ڈیوٹی پر تھے اور ابرار پتا نہیں کہاں تھا۔ میرے غم کی شدت اتنی تھی کہ میں ہولے، ہولے سیڑھیوں کی دیوار کے ساتھ سر مارنے لگی۔

جب ابرار گھر میں داخل ہوا تھا۔

"کتنی دفعہ کہا ہے ویرا...... جب امی وغیرہ گھر پر نہیں ہوں تو دروازہ بند کر لیا کرو۔"

وہ مجھے دور سے ہی دیکھتا اور بولتا ہوا قریب آیا تھا اور پھر مجھے دیوار کے ساتھ سر مارتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"یہ، یہ کیا کر رہی ہو ویرو......" اس نے مجھے روکا...... میری آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں نے ایک بار پھر سر دیوار میں مارا تھا۔ میرے ماتھے پر گومڑ بن گیا تھا لیکن مجھے درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ درد اس سے کہیں زیادہ تھا جو میرے اندر تھا۔

"مت کرو، ایسا ویرا۔" اس نے پریشان ہو کر مجھے روکا۔

پھر وہ میرے پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ہے، کیوں کر رہی ہو ایسا...... ویرا مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔

میری عمر سولہ سال تھی اور جو درد میرے دل میں اترا تھا وہ مجھ سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ میں لاشعوری طور پر اس درد کو کم کرنے کے لیے جو اندر وجود کو کاٹتا تھا...... خود کو تکلیف دے رہی تھی لیکن اندر درد تو ایسا ہی تھا اور باہر کی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی...... اس روز باری نے جس طرح میرے درد کو اور میری تکلیف کو محسوس کیا تھا اس سے میرے اور باری کے درمیان ایک نئے رشتے کی بنیاد پڑی تھی۔ محبت کے رشتے کی...... لیکن تب میں اس بات سے بے خبر تھی کہ میرے اور باری کے درمیان یہ کیسا بندھن بندھا ہے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں لیکن میرے قلم نے اس رات آنسو بہائے تھے اور جب میں نے اپنی تخلیقات مس ربانی کو دکھائی تھیں تو مس ربانی نے حیرت اور خوشی سے مجھے گلے لگا لیا تھا۔

"تم ایک دن بڑا نام کماؤ گی سویرا۔" اور ایسا ہی ہوا تھا۔ انیس سال کی عمر میں میرا پہلا مجموعۂ کلام تشنہ لب، جب منظر عام پر آیا تھا تو اسے جو پذیرائی ملی اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا...... یہ سب مس ربانی کی کوششوں سے ہوا تھا۔ مجھے تو کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے تو بس اپنا سارا کلام اکٹھا کر کے انہیں دے دیا تھا۔ مس ربانی چاہتی تھیں کہ کتاب کی تقریب رونمائی ہو اور میں بھی اس میں شرکت کروں لیکن میں نے منع

کر دیا۔ میں بہت خوف زدہ تھی۔ ابھی تک استانی جی اور صوبیدار انکل نہیں جانتے تھے کہ میں نہ صرف شاعری کر رہی ہوں بلکہ میری ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ان کا ردعمل کیا ہوگا...... ہوسکتا ہے انہیں یہ سب اچھا نہ لگے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا جب باری نے استانی جی اور انکل کو بتایا تو سب نے حیرت بھری خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ارے مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ میری بچی بہت جینئس ہے۔" یہ استانی جی تھیں۔ میں چپ بیٹھی تھی۔

"ارے واہ..... ہماری بہنا تو چھپی رستم نکلی۔"

انصار بھائی بھی ان دنوں چھٹی پر آئے تھے۔ ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ انصار بھائی کی بھی منگنی ہوگئی تھی۔ انصار بھائی کی شادی کسی کرنل کی بیٹی سے ہو رہی تھی..... شادی میں سگی بہنوں کی طرح ہی مجھے نیگ ملے..... استانی جی نے ہر فنکشن کے لیے بہترین لباس تیار کروایا..... بلکہ شروع سے لے کر اب تک انہوں نے اچھا کھلایا، اچھا پہنایا، بہترین اداروں میں تعلیم دلوائی پھر بھی میرے اندر کیسی تشنگی تھی اور کتنی پیاس تھی..... میرے اندر ہر وقت کن من ہوتی رہتی تھی۔ میں کیا چاہتی تھی، کبھی کبھی تو مجھے سمجھ نہیں آتا تھا..... میں نے کبھی خوشی کو خوشی کی طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر بھی محبت کی ایک کونپل میرے اندر پھوٹ چکی تھی۔

باری کی محبت کی کونپل لیکن مجھے اس کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ یہ محبت ہے۔ باری میرا خیال رکھتا تھا۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے تھے لیکن نہ کبھی اس نے اور نہ میں نے اس سے کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ہماری گفتگو اب زیادہ تر میرے کلام اور میری کہانیوں پر ہوتی تھی جو تواتر سے چھپ رہی تھیں۔ نقاد میری کتاب پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اکثر مضامین مجھے مس ربانی بھجوا دیا کرتی تھیں۔ چونکہ مجھے اب اسکول چھوڑے چار سال ہو چکے تھے اور میری ملاقات کم، کم ہو پاتی تھی۔ ہاں فون پر رابطہ رہتا تھا...... ایک روز انہوں نے مجھے مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوایا...... لیکن باری نے مجھے منع کر دیا۔

"تم مشاعرے میں نہیں جاؤ گی ویرا...... وہاں لوگ تمہارے سامنے واہ، واہ کریں گے اور تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ذات پر تبصرہ کریں گے...... یہ لوگ خواتین شاعرات کے ساتھ مخلص نہیں ہوتے ..... عزت نہیں کرتے اور پھر خواہ مخواہ اسکینڈل بن جاتے ہیں۔"

"تم چاہتے ہو میں نہ لکھوں.....؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں...... میں ایسا نہیں چاہتا..... تم لکھو، تمہارے اندر ٹیلنٹ ہے اسے ضائع مت کرو لیکن مشاعروں وغیرہ میں شرکت نہیں کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے دعوت نامہ پھاڑ دیا۔

اور پھر میں نے کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ اندازے لگانے والوں نے اندازے لگائے۔

سویرا اقبال کسی کنزرویٹو فیملی سے تعلق رکھتی ہے، وہ بدصورت ہے۔ نقاد میری تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے میری ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ جملے لکھ دیتے تھے۔ کسی نے لکھا۔ میرا بیک گراؤنڈ مشکوک ہے، شاید اسی لیے میں نے آج تک انٹرویو نہیں دیا۔

کسی نے میرے ماضی کو شرمناک کہا۔ کسی نے کہا کہ سویرا اقبال فرضی کردار ہے، پس پردہ کوئی اور ہے لیکن مجھے ایک بڑی شاعرہ قرار دینے والوں کی بھی کمی نہیں تھی...... جو میری ذات کو الگ کر کے میری تحریر دیکھتے تھے......

میری کتاب کو آدم جی ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ کئی دوسری تنظیموں نے بھی ایوارڈ دیے۔

میرے سب ایوارڈ مس ربانی نے ہی وصول کیے تھے۔ اکیس سال کی عمر میں میری دوسری کتاب ہجر بھی آگئی تھی۔ پہلی کتاب کے ان دو سالوں میں کئی ایڈیشنز آ چکے تھے اور میرے اندر عجب بے کلی سی

تھی ایک بار باری نے کہا تھا۔

"ویرا...... تمہارا دل چاہتا ہے میانے ہزارے جانے کو تو میں تمہیں لے چلتا ہوں۔ سب سے مل آؤ گی تو یہ بے کلی ختم ہو جائے گی۔"

میرے اندر سے ہاں، ہاں کی آواز آرہی تھی لیکن لب خاموش تھے...... میرے اندر ہاں اور نہ کی جنگ شروع ہو گئی تھی پھر انا کی اس جنگ میں طلب اور محبت ہار گئی۔ انا اور خودداری جیت گئی۔ انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میری طلب نہیں...... بہنوں کی شادیوں پر اماں نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔ کیا تھا اگر وہ مجھے بلا لیتیں...... کتنا شوق ہوتا ہے ناں بہنوں کی شادیوں میں شریک ہونے کا لیکن دل کے اندر جیسے بہت سارے دیے جل کر بجھ گئے تھے۔

"نہیں...... میرا نہیں جی چاہتا۔" میں نے سارے آنسو اپنے اندر اتار لیے تھے۔ میں نے بی ایڈ کیا اور پھر ماسٹر کیا پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا اور پہلے ایس۔ ایس ٹی پر تقرری ہوئی پھر ایک مڈل اسکول میں ہیڈ مسٹریس کی سیٹ ملی۔ استانی جی کے گھر میں سب ہی خوش تھے۔ میری کامیابیوں پر...... باری بھی اب اچھی پوسٹ پر تھا...... اور گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اس روز باری میری نظم مراجعت پر تبصرہ کر رہا تھا۔

"تمہاری اس نظم میں تڑپ ہے اپنے اصل کی طرف واپس پلٹ جانے کی۔"

"ہاں شاید۔"

"شاید نہیں یقیناً۔" وہ مسکرایا تھا۔

"مراجعت میں ہی نہیں کئی اور چیزیں بھی ہیں' تمہاری ایسی جن میں میانے ہزارے سے بچھڑنے کا دکھ ہے۔ واپس جانے کی تڑپ ہے، تم صرف نو سال کی تھیں تب لیکن تم میانے ہزارے کو نہیں بھولی ہو۔"

"میانے ہزارے" صرف ایک گاؤں نہیں ہے...... اس گاؤں میں میرے اماں، ابا، بہنیں اور بھائی ہیں۔ اس گاؤں سے تو خون کے رشتے جڑے ہیں باری۔" میں نے سوچا تھا لیکن کہا نہیں تھا۔

"اس گھر میں تمہیں اتنی محبت ملی...... امی، ابو نے ہمیشہ تمہیں بیٹی سمجھا ہے۔ کبھی تم میں اور ہم میں فرق نہیں کیا۔"

"محبت......؟" میں نے خالی، خالی نظروں سے باری کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں...... محبت نہیں، ترس، ہمدردی......" جانے کب کا دبا لاوا بہہ نکلا تھا۔

"کیا صرف ترس اور ہمدردی میں کوئی اس طرح کرتا ہے...... اتنا......؟" باری کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"امی تمہارا کتنا خیال کرتی ہیں...... اور ابو وہ تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں...... یہ سچ ہے، استانی جی نے میرا ہمیشہ خیال رکھا...... لیکن انہوں نے مجھ سے محبت نہیں کی...... انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھا...... کھلایا، پلایا لیکن بیٹی سمجھا نہیں...... مجھ پر ان کے احسانوں کا بوجھ ہے...... انہوں نے ہمیشہ سب سے یہی کہا کہ میری اماں کی پانچ بیٹیاں تھیں اور مجھ پانچویں کو اماں بلاوجہ مارتی تھیں۔ اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئیں۔" میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

"استانی جی کہتی ہیں، میں جب پیدا ہوئی تو میری اماں کو میری ضرورت نہ تھی۔ انہیں تو وانی کے لیے بھائی چاہیے تھا...... اور استانی جی کو بھی میری ضرورت نہیں تھی...... وہ صرف مجھے اماں کی ناراضی اور غصے سے بچانے کے لیے اپنے ساتھ لے آئی تھیں اور پھر...... نیکی کمانے لگیں۔ میں کہیں بھی کسی کو بھی مطلوب نہیں تھی نہ ہوں باری۔"

"تم...... تم مجھے مطلوب ہو ویرا......" باری نے

بے اختیار میرے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت کہ تم اندازہ بھی نہیں کرسکتیں..... ہررات سونے سے پہلے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں...... اللہ مجھے سویرا کو دے' دے۔ اسے میرا رفیق بنادے...... میں، میں تمہیں چاہوں گا ویرا...... اتنا کہ تم میری محبتوں سے اکتا جاؤ گی، تھک جاؤ گی۔"

"محبتوں سے بھی کوئی اکتایا ہے باری؟"

میری آواز میں لرزش تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

"ہاں، محبتوں سے بھی کوئی نہیں اکتایا ویرا......" پہلی بار وہ اظہار کررہا تھا اور میرے اندر کا خلا جیسے بھرتا جارہا تھا اور دل کی پیاسی زمین سراب ہورہی تھی۔ وہ شاعر یا ادیب نہیں تھا لیکن اس کے پاس اظہار کے اتنے خوب صورت لفظ ہوں گے۔ مجھے یقین نہیں تھا۔

ایک بار اس نے اپنے جذبوں کا اظہار کیا کیا تھا کہ اب تو آتے جاتے اس کی آنکھیں جذبے لٹاتیں۔ جب بھی وہ اور میں اکٹھے ہوتے، میری شاعری پر بات کرتے، کرتے وہ موضوع سے ہٹ جاتا۔

"ویرا تمہیں پتا ہے تم کتنی خوب صورت ہو...... لیکن تمہارا حسن ایک دم فوراً پہلی نظر میں دل میں نہیں کھبتا، ہولے، ہولے سرچڑھ کر بولتا ہے۔ پہلے یہ قاتل آنکھیں قتل کرتی ہیں پھر یہ پلکوں کے بھالے دل میں کھب جاتے ہیں اور پھر یہ دلکش ہونٹ اپنی رعنائیاں......"

"تمہیں تو ادیب یا شاعر ہونا چاہیے تھا باری۔" میں ہنسی۔

"میری بیوی شاعر ہوگی..... کیا یہ کافی نہیں ہے۔" اس کی نظریں میرا طواف کرتیں۔ ان دنوں میں اتنی خوش تھی جتنی کبھی نہیں تھی..... اور ان دنوں میری شاعری میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ اب اس میں محبت کی میٹھی، میٹھی کسک بھی شامل ہوگئی تھی۔ مستقبل کے خواب تھے اور امیدوں کے جگنو تھے۔

"شادی کے بعد میں تمہیں میانے ہزارے لے چلوں گا۔"

"سچ......" میرے اندر چراغاں ہوگیا تھا۔

"کب......؟"

"تمہیں بہت جلدی ہے۔" وہ شرارت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں دل کی بات کسی سے نہیں کہتی تھی اندر ہی اندر دفن کرلیتی تھی لیکن اب باری سے ہر بات کہنے لگی تھی۔

"چند دنوں کے لیے کراچی جارہا ہوں، واپس آکر طے کرتے ہیں کہ کب...... ویسے امی سے بات ہوگئی ہے، انہیں اعتراض نہیں ہے۔"

اور باری کراچی چلا گیا...... ادھر میرے ٹرانسفر کے آرڈرز آگئے...... ایک قریبی قصبے میں ایک پرائمری اسکول کو مڈل اسکول کا درجہ دیا گیا تھا اور مجھے وہاں بھیجا جارہا تھا۔ اس اسکول کی ہیڈ بنا کر...... میں نے باری کو فون کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی ریزائن دے دو اور یوں بھی میں بلاضرورت خواتین کی جاب کو پسند نہیں کرتا..... ہاں اگر تم کرنا چاہو تو منع بھی نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" مجھے باری کی بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا مجھے استانی جی کو بتانا چاہیے کہ میں جاب چھوڑنا چاہتی ہوں۔ اس روز میں بریک میں گھر آگئی تھی۔ استانی جی کے پاس ان کی کوئی پرانی کولیگ آئی ہوئی تھیں۔

"ارے ہاں، تم نے پھر باری کے لیے لڑکی پسند کرلی۔ اگر نہیں کی تو ایک لڑکی ہے، میری نظر میں۔" میں نے اپنے کمرے کی طرف جاتے، جاتے سنا اور غیر ارادی طور پر اپنے کمرے کے

دروازے کے پاس ہی رک گئی۔

"لڑکی تو گھر میں ہی تھی، میں خواہ مخواہ ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔"

استانی جی ہنسیں۔

"کون تمہاری بھابھی......؟"

"ارے نہیں، اپنی سویرا، ماشاء اللہ اچھی سگھڑ، سلیقہ مند، ذہین، پورا گھر سنبھالا ہوا ہے اس نے...... پہلے کئی بار ذہن میں آیا تھا۔ ابصار سے تو پوچھا بھی تھا میں نے لیکن اس نے کہا وہ سویرا کو سگی بہن سمجھتا ہے۔ ایک ساتھ پل کر بڑے ہوئے ہیں تو میں نے سوچا باری بھی ابصار کی طرح...... لیکن پھر باری نے خود مجھے کہا کہ وہ سویرا سے شادی کرنا چاہتا ہے تو......"

"اور بھائی صاحب کو اعتراض نہیں ہوا؟"

استانی جی کی کولیگ پوچھ رہی تھیں۔

"انہیں بھلا انہیں کیا اعتراض ہونا تھا۔ ظاہر ہے باہر سے جو آئے گی وہ نہ جانے کیسی ہو...... یہ اپنی دیکھی بھالی ہے۔ اور پھر لاکھوں میں ایک......"

استانی جی نے جواب دیا تھا۔

"تم نے بھی ایک ناتراشیدہ پتھر کو تراش کر ہیرا بنا دیا ہے۔ چلو جہاں اتنے احسان کیے ہیں اس پر وہاں بہو بنا کر ایک اور...... احسان سہی...... ورنہ باری کے لیے بڑے، بڑے خاندانوں......" اور میں باقی بات سنے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی۔

"احسان......" میرے لبوں سے نکلا......

میرے اندر چند لمحوں پہلے جو گلستان آباد ہوا تھا وہ یک دم اجڑ گیا تھا۔ جیسے آسمانی بجلی گر پڑی ہو یا اندر دھول اڑ رہی تھی اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ کتنی ہی دیر تک میں یونہی ساکت بیٹھی رہی۔

"نہیں مزید احسان نہیں......" بڑی دیر بعد میرے لبوں سے نکلا تھا اور میں جو پورا ایک گھنٹا اپنی ٹرانسفر کروانے کی خاطر ڈی ای او سے بحث کر کے آئی تھی...... انہیں فون کر کے کہہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میم، میں جانے کے لیے تیار ہوں۔" مجھے اب اپنے گلے میں مزید احسانوں کا طوق نہیں ڈالنا تھا۔ مجھے باری سے شادی نہیں کرنا تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا لیکن یہاں رہ کر میں باری کی محبتوں سے دامن نہیں چھڑا سکتی تھی۔ اس کی محبت مجھے کمزور کردیتی اور میں ایک اور احسان کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانے کے لیے مجبور ہو جاتی۔ میری گردن پہلے ہی احسانوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

مجھے ایک ہفتے بعد جوائن کرنا تھا لیکن میں اگلے ہی دن جانے کے لیے تیار ہو گئی کیونکہ میں باری کے آنے سے پہلے جانا چاہتی تھی۔ میں نے استانی جی سے اجازت نہیں مانگی تھی صرف مطلع کیا تھا۔ وہ پریشان ہو گئیں۔

"لیکن ویرا وہاں اکیلے کیسے رہو گی...... تمہارے انکل کسی سے بات کرتے ہیں ٹرانسفر رکوانے کی۔ انصار اور ابصار سے بات کرتی ہوں، اگر کچھ نہیں ہوسکتا تو جاب چھوڑ دو کیا ضرورت ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں، استانی جی میں اب بچی نہیں ہوں...... وہاں اسکول کے ساتھ ہی ہیڈ کی رہائش کے لیے کوارٹر بنا ہوا ہے۔"

"لیکن پھر بھی ویرا...... میرا دل نہیں مانتا......" وہ ہنوز پریشان تھیں۔ "خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں تمہارے والدین کو کیا جواب دوں گی۔"

"میرے والدین......؟" میرے اندر کڑواہٹ پھیل گئی۔

"وہ آپ سے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ برسوں پہلے وہ مجھ سے دستبردار ہو گئے تھے۔" میری آنکھوں میں کنکر چبھنے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا میں بغیر بتائے چلی جاؤں لیکن وہ میرے سرپرست تھے...... مجھے بہر حال انہیں بتانا چاہیے تھا۔

باری کو پتا چلا تو وہ اسکول سے پتا لے کر بھاگتا

چلا آیا۔

"یہ کیا حماقت ہے ویرا......؟"

"حماقت......نہیں تو......" میری آنکھوں کے خالی پن نے باری کو چونکا دیا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں......" میں نے نظریں چرائی تھیں۔

"میں تھک گئی ہوں......" میری جلتی ہوئی آنکھوں میں چبھن تھی۔

"مزید احسانوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ ان احسانوں کے بوجھ سے میری گردن جھک کر ٹھوڑی سے آ لگی ہے، اب ٹوٹ جائے گی۔ میں نے استانی جی کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ مجھ پر ان کے احسانوں کا بوجھ ہے۔ میری گردن اس بوجھ سے ہمیشہ جھکی رہے گی......لیکن مجھ پر ان کی محبت کا بوجھ نہیں ہے۔ احسانوں کا بدلہ اتارا جا سکتا ہے ناں باری لیکن محبت کا نہیں......اور میرا رُواں، رُواں ان کا احسان مند ہے...... میں ساری زندگی ان کی خدمت کر کے بھی ان احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتی کہ انہوں نے مجھ بے مایہ، حقیر کو میانے ہزارے کے کچے ویہڑے سے اٹھا کر کیا سے کیا بنا دیا...... میں جو کچھ ہوں ان کی وجہ سے ہوں...... لیکن مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں ہے...... میں وہاں رہ کر اپنے دل کو...... روک نہیں سکوں گی...... تم نے مجھے کیوں چاہا...... باری...... کیوں محبت کی؟"

وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا...... بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں سویرا۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ "اور تم...... کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں......؟" میں نے سر جھکا لیا۔

"میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے محبت ہی کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ اماں، ابا کی محبت کے لیے...... استانی کی اور انکل کی محبت کے لیے......اور پھر اللہ نے بن مانگے ہی میری جھولی میں محبت ڈال دی۔ ایسی محبت جس کی میں نے طلب نہیں کی تھی......اور اس محبت نے میرے اندر رنگ بکھیر دیے، روشنیاں پھیلا دیں لیکن......" میں نے ایک گہری سانس لے کر جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ بے چینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"بولو ناں...... بولتی کیوں نہیں ہو...... کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

مجھے اس سے محبت تھی...... ہے...... اور ہمیشہ رہے گی لیکن میرے اندر جو ایک پہاڑ سا اٹھ آیا تھا...... انا کا پہاڑ یا پھر...... پتا نہیں کیا...... اس نے میرے لب سی دیے تھے۔ میں محبت کو محبت کی طرح قبول کرنا چاہتی تھی...... احسان کی طرح نہیں۔

"اپنے ساتھ یہ ظلم مت کرو ویرا...... میں جانتا ہوں تم میرے بغیر رہ نہیں سکو گی۔"

"اتنے سارے سال بھی تو محبت کے بغیر گزارے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم رہ لو گی لیکن میں نہیں......" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"سنو ہم دونوں کہیں الگ رہ لیں گے جہاں تمہیں یہ نہ لگے کہ تمہیں چاہت سے اس گھر میں نہیں لایا جا رہا بلکہ احسان کر کے......"

"تم مجھے ایسا سمجھتے ہو باری؟" مجھے افسوس ہوا تھا۔ "استانی جی کے احسانوں کا بدلہ میں ان کا بیٹا چھین کر دوں۔"

اور وہ چلا گیا...... مجھے پتا تھا کہ وہ پھر آئے گا۔ دو روز بعد وہ پھر آ گیا......اور وہ آتا رہتا حتیٰ کہ میں ہار جاتی...... میں اس کے سامنے کمزور پڑنے لگی تھی۔

"اچھا ایسا کرو میانے ہزارے چلی جاؤ...... میں وہاں سے تمہیں پوری چاہت کے ساتھ بیاہ کر لے آتا ہوں۔" اس روز جب وہ آیا تھا تو اس نے کہا تھا۔

لیکن میں کیوں جاتی میانے ہزارے وہاں کسی کو میری چاہ نہیں تھی...... اماں نے خود مجھے دے دیا

تھا اور پھر کبھی پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں...... جب سے میں نے جاب کی تھی کئی بار سوچا تھا کہ کسی روز وین پر بیٹھوں اور چپکے سے میانے ہزارے میں دین محمد زمیندار کے گھر کا دروازہ کھول کر اس بڑے سے کچے صحن میں پہنچ جاؤں اور جہاں چارپائی پر بیٹھے حقہ پیتے ابا مجھے دیکھ کر حقہ پینا بھول جائیں اور چولھے کے پاس بیٹھی گیلی لکڑیوں کو پھونکیں مارتی اماں کی آنکھوں میں حیرت اتر آئے اور میری بہنیں اور بھائی قطار بنا کر حیرت سے مجھے دیکھیں...... لیکن میں بھلا کیوں جاتی...... انہیں کب میری طلب یا چاہت تھی اور میرے اندر جو انا کا پہاڑ ایک روز آپوں آپ کھڑا ہو گیا تھا وہ ہر روز پہلے سے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ ہر روز میں سونے سے پہلے میانے ہزارے جانے کا ارادہ کرتی اور ہر روز صبح اٹھنے پر میری انا مجھے چوکے مارتی اور میں خود سے کہتی۔ نہیں مجھے نہیں جانا...... سو میں نے سوچا وہ آتا رہتا تو ایک روز میں ان کی محبت کے سامنے کمزور پڑ جاتی یا اپنی محبت کے سامنے سو میں نے دو ماہ کی چھٹی لی اور مس ربانی کے پاس لاہور چلی آئی۔ مس ربانی جو ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور سیٹل ہو گئی تھیں جو میری محسن تھیں، میری استاد تھیں...... اور جنہوں نے ابھی تک میری انگلی پکڑی ہوئی تھی پھر ان کی ہی کوشش سے میں نے کسی اور جگہ ٹرانسفر کروا لیا۔ مس ربانی نے مجھے سمجھایا۔

"محبت سے منہ موڑ کر دکھ پاؤ گی۔ وہ لوگ جنہیں تم چھوڑ آئی ہو، انہوں نے ہی تمہیں اس مقام تک پہنچایا ہے...... صرف ترس و ہمدردی میں کوئی ایسا نہیں کرتا سویرا...... کچھ لگاؤ تو ہوگا ناں انہیں۔" مجھے سمجھانے کے باوجود میرے عمل کو غلط سمجھنے کے باوجود انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ میرے میگزین، میری ڈاک، میری رائلٹی سب انہی کے ایڈریس پر آتی تھی اور پھر وہ مجھے اکٹھی بھجوا دیتیں۔ میں نے کبھی کہیں کسی کو انٹرویو نہیں دیا، کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی...... جہاں کہیں میں جاتی وہاں میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میں ہی سویرا اقبال ہوں...... جس کا نام ادب میں معتبر سمجھا جاتا ہے......

کئی بار میرے سامنے بیٹھ کر میری کولیگ، میری شاعری کی تعریف کرتی رہیں لیکن میں مہر بلب بیٹھی رہی...... میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے جانے اور مجھے کھوجتا ہوا یہاں تک پہنچے...... میں انٹرویو نہیں دیتی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو میرے ویراباؤٹس کا پتا چلے اس لیے نہیں کہ میرے حوالے میرے لیے شرمناک تھے...... بلکہ اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو پتا چلے کہ میں کسی کو مطلوب نہیں تھی اور اتنے سالوں بعد نہ جانے کہاں غلطی ہوئی تھی مجھ سے کہ سراج الحق اور عرفان حنیر کھوجتے ہوئے آ گئے تھے۔ میں نے سوچا اور......

"اوہ...... میرے خدایا!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

☆☆☆

یہ آج سے چار دن پہلے کی بات تھی۔ آفس میں وہ کون تھی...... مجھے نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اسکول ٹیچر تھی کسی کام کے سلسلے میں آئی تھی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ارے آپ سویرا ہو ناں...... ہم نے سیالکوٹ میں ایک ہی اسکول میں پڑھا ہے...... آپ نے ان دنوں لکھنا شروع کیا تھا...... میں دسویں جماعت میں تھی اور آپ نویں میں...... مس ربانی ہماری کلاس میں آتیں تو بہت تعریف کرتی تھیں آپ کی...... اب جہاں کہیں بھی آپ کی کوئی تحریر چھپتی ہے، میں ضرور پڑھتی ہوں، میں سب کو بتاتی ہوں یہ اتنی مشہور شاعرہ میری اسکول فیلو ہے۔"

وہ بغیر رکے بول رہی تھی اور اتنے یقین سے بات کر رہی تھی کہ میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں

تھا...... میں اس سے یہ جھوٹ نہیں بول سکی تھی کہ نہیں
میں وہ سویرا اقبال نہیں ہوں...... وہ مجھے بائے فیس
بھی پہچانتی تھی اور...... اس نے میری کتابوں کے
سلسلے میں ہونے والی ایک دو تقریبات میں بھی
شرکت کی تھی۔

"میں تو صرف آپ کی خاطر وہاں گئی تھی لیکن
پھر وہاں پتا چلا کہ آپ نہیں آتیں ایسی تقریبات
میں۔ مس ربانی بتا رہی تھیں کہ آپ کے والدین پسند
نہیں کرتے۔ دراصل میرے شوہر صحافی ہیں تو
ہمیں ایسی تقریبات کے کارڈ مل جاتے ہیں۔"

"تو یہ بات ان محترمہ سے ہی لیک آؤٹ ہوئی
تھی۔ او مائی گاڈ......"

مجھے یاد آیا جب آفس آئی تھی تو کسی نے بتایا تھا
کہ مسز عرفان آئی ہیں تو...... وہ مسز عرفان......

"میڈم جی آپ کا فون ہے۔"

ماسی خیراں نے دروازے سے جھانکا تو میں
چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آفس سے آیا ہے جی ساجد صاحب کا......"

ساجد سے بات کر کے میں ماسی خیراں کو ایک
کپ چائے بنانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔
جسم و جان میں اتنی تکلیف تھی جیسے زخموں کے ٹانکے
کھل گئے ہوں۔ کسی پل چین نہیں...... دل بہت......
بے کل تھا میں نے اچھا کیا تھا یا برا...... میں آج یہ فیصلہ
نہیں کر پا رہی تھی۔ اندر دور تک پیاس کا صحرا اگ آیا
تھا۔ اس پیاسی زمین پر باری کی محبت کے جو چند
قطرے پڑے تھے۔ ان کی ٹھنڈک ہمیشہ ہی رگ و
پے میں سکون اتار دیتی تھی لیکن آج...... میں نے
اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو رگڑا...... یہ میں نے کیا، کیا
تھا میں باری کی محبت سے بھی بھاگ آئی تھی۔ باری
جو کہتا تھا کہ وہ مجھ سے اتنی محبت کرے گا کہ برسوں کی
پیاس بجھ جائے گی لیکن میں نے اس کی محبت کا مان
بھی توڑ دیا تھا، یہ اور امی جی...... کتنا خیال رکھا

انہوں نے میرا...... انصار بھائی اور ایسار بھائی بھی
کبھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ میرے لیے
لاتے پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ جیسے انہوں
نے مجھ سے محبت نہیں کی۔

"اور کیا میں احسان فراموش ہوں......؟"
میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور خیراں کی لائی گرم
چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"نہیں......" میں نے ایک بار پھر خود کو باور
کرایا "میں احسان فراموش نہیں ہوں، بس میں محبت
کو محبت کی طرح دل میں زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ اسے
احسان نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اسی لیے تو میں نے باری
سے التجا کی تھی کہ مجھ سے میری محبت مت چھینے لیکن
وہ میری بات سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا اور میں نے محبت کو
احسان میں ڈھلنے سے بچا لیا تھا لیکن پھر بھی میرا دل
کیوں خالی، خالی سا لگتا ہے حالانکہ یہ باری کی محبت
سے لبالب بھرا ہے۔ پھر بھی...... پھر بھی...... کیا
میرے اندر کہیں پچھتاوے کی فصل اگ چکی ہے۔"

میری آنکھیں جلنے لگیں اور میں اپنی سوچوں سے گھبرا
کر کچن میں خیراں کے پاس چلی آئی اور کوکنگ میں
اس کی ہیلپ کرنے لگی لیکن دھیان تھا کہ بار بار پھر
ماضی کی طرف چلا جاتا...... پورا دن میں بے کل اور
بے چین رہی اور رات میں مجھے سکون کی گولی لینی
پڑی۔ کبھی، کبھی مجھے یونہی نیند کی گولیوں کا سہارا لینا
پڑتا تھا۔ جب باری یاد آتا، جب اپنی بے قدری کا
خیال آتا اور جب تنہائی ستاتی تو نیند کی ایک چھوٹی سی
گولی میری بے چینیوں کو دور کرتی تھی۔ اگلی صبح
میں اٹھی تو کسی حد تک فریش تھی۔ ناشتے کی ٹیبل پر
میں نے عادت کے مطابق اخبار کھولا، قومی اخبار
کے ساتھ ایک مقامی اخبار بھی تھا۔ چار صفحوں پر
مشتمل اس اخبار کے پہلے صفحے پر ہی ایک خبر نے
مجھے چونکا دیا۔

"ہمارے شہر میں مشہور شاعرہ سویرا اقبال کی

آمد......" عرفان منیر نے ڈی ای او کی حیثیت سے میری تقرری کی خبر چھاپی تھی اور میری شاعری اور دوسری تحریروں کے اور ادب میں میرے مقام کے حوالے سے چھوٹا سا نوٹ لکھا تھا۔

مجھے از حد کوفت ہوئی لیکن ظاہر ہے اب میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بہتر تھا کہ میں یہاں سے جلد از جلد تبادلہ کروانے کی کوشش کروں۔ میں نے سرسری سی نظر اخبار پر ڈال کر اخبار بے پروائی سے ایک طرف رکھ دیا، مجھے یہ اطمینان تھا کہ یہ ایک مقامی اخبار ہے اور اس شہر میں بھلا کتنے لوگ ہوں گے جنہیں ادب سے کوئی تعلق ہوگا اور جو سویرا اقبال کو جانتے ہوں گے...... ہادی، استانی جی سب سیالکوٹ میں تھے اور بھلا یہ اخبار کہاں سیالکوٹ جاتا ہوگا...... میں نے پُرسکون ہو کر ناشتا کیا اور آفس آگئی......میرا ارادہ تھا کہ میں آج شہر کے اسکولوں کا وزٹ کروں گی لیکن میرے آفس جانے کے کچھ ہی دیر بعد مسز افضل جو ہائی اسکول نمبر دو کی ہیڈ مسٹریس تھیں......آ گئیں۔ انہیں رخصت کر کے میں جونہی مڑی ایک دم دروازہ کھول کر کسی نے کہا۔

"مے آئی کم اِن میم!"

یہ آواز...... میں ایک جھٹکے سے مڑی اور پھر وہیں ساکت کھڑی ہو گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہادی ہوگا۔

"ہادی تم......؟" بہ مشکل میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"تمہیں توقع تو نہیں ہوگی کہ میں کبھی تمہیں ڈھونڈتا ہوا تم تک آپہنچوں گا۔"

"ہادی آؤ بیٹھو......" میں نے تھوک نگلتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میز کا چکر کاٹ کر میز کے پیچھے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ میں نے نظریں اٹھائیں وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا مجھے۔ لگا جیسے میرا دل ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر

باہر آ گرے گا۔

''بیٹھ جاؤ پلیز......'' میں نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ ہولے ہولے چلتا ہوا میری ٹیبل کے سامنے آیا اور دونوں ہاتھ ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''سب......سب کیسے ہیں...... استانی جی، انکل، انصار بھائی؟''

''تمہیں کیا سویرا اقبال......تم تو سب کو چھوڑ آئی تھیں۔ سو تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون کیسا ہے؟'' اس کی آواز دھیمی لیکن مضبوط تھی۔

''اگر ان میں سے کسی کو کچھ ہو جائے تو کیا مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیا واقعی......؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور میرا دل زور سے کانپا...... ''اللہ نہ کرے کسی کو کچھ ہو......'' میں نے زیر لب کہا۔

''تم خود کو کیا سمجھتی ہو سویرا اقبال......؟'' ناراضی اس کی خوب صورت آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ ''تم نے کبھی سوچا کہ جن لوگوں کو تم بلا قصور چھوڑ آئی ہو، وہ تمہارے لیے کتنا ترسے ہوں گے، کیسے گزرتے ہوں گے ان کے شب و روز، کیسے تم نے سارے گھر میں خزائیں بکھیر دیں۔ کبھی سوچا تم نے؟ کب، کب یاد نہیں کیا ہوگا انہوں نے......لیکن تم......''

''میں......!'' میں نے نظریں نہیں اٹھائیں لیکن میں جانتی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ہوگی۔

اور کیا میں نے یاد نہیں کیا انہیں صبح شام...... دن، رات جب کوئی عید، تہوار آتا تو مجھے یاد آتا تھا کہ کیسے انصار بھائی اور ابصار بھائی مجھے چوڑیاں پہنانے لے جاتے تھے، کیسے استانی جی میرے کپڑے تیار کرواتی تھیں، صوبیدار انکل، انصار بھائی، سبھی سے مشورہ کیا جاتا تھا...... میرے آنسو میرے اندر گرتے تھے اور میں نے ان بیتے سالوں میں کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔

''یوں تو تم بڑی حساس بنتی ہو۔'' اس نے میز پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا اور تھوڑا سا اور آگے جھکا۔

''لیکن تم نے شاید ہی کبھی سوچا ہو کہ وہ لوگ تمہارے لیے کتنا ترستے ہوں گے، کتنا یاد کرتے ہوں گے تمہیں۔ ان کی راتوں کا آغاز اور دن کا اختتام تمہاری باتوں پر ہوتا ہے، سویرا اقبال...... امی ہر صبح تمہارے کمرے کی صفائی کرواتی ہیں، تمہاری کتابیں اور تمہاری چیزیں یوں جھاڑ پونچھ کر رکھتی ہیں جیسے بس تم آنے ہی والی ہو...... ابو بے دھیانی میں دن میں کتنی بار تمہیں پکار بیٹھتے ہیں...... امی، ابو کا خیال ہے کہ ان کی محبت تمہیں واپس لے آئے گی لیکن......'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

''وہ نہیں جانتے کہ تم نے ان کی محبت کو محبت کب جانا۔ تمہارے خیال میں تو وہ ترس اور ہمدردی تھی، رحم تھا، نیکی کمانے کی خواہش تھی، وہ روتی ہیں، میں منع کرتا ہوں تو وہ کہتی ہیں، گھر میں مرغی بھی رکھو تو اس سے محبت ہو جاتی ہے، تمہیں تو وہ بیٹی بنا کر لائی تھیں اور بیٹی کی طرح ہی چاہا...... لیکن انہیں کیا پتا......'' اس کا لہجہ مزید تلخ ہوا۔

''ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو محبت اور ترس کا فرق ہی نہیں پتا...... معاف کرنا سویرا اقبال، تم ساری زندگی محبت کی طالب رہیں لیکن محبت کو پہچان نہیں پائیں، تمہیں پتا ہی نہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے، تمہارے پاس وہ نظر ہی نہیں ہے، تمہارے سارے لفظ اور جذبے کھوکھلے ہیں۔''

''نہیں......'' میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں......تم تو یہ بھی نہیں جان پائیں کہ میں تمہارے بغیر......اور تم نے میری محبت پر بھی اعتبار نہیں کیا۔'' اس کی آواز آہستہ ہو گئی اور آنکھیں جیسے کسی اندرونی تپش سے سلگنے لگیں۔

''تم ساری عمر خود ترسی میں مبتلا رہیں اور اپنے

اردگرد موجود محبتوں کو پہچان ہی نہیں پائیں۔ میں گیا تھا میاں نے بزارے...... میں نے دیکھی تمہاری اماں اور تمہارے ابا کی تڑپ..... تمہیں ایک نظر دیکھنے کو تڑپتے ہیں وہ..... میں نے بتایا انہیں کہ تم کیا سمجھتی ہو کہ.....

تمہاری اماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔"

"میرا اندر خالی ہو گیا ہے بیٹا..... ایک بار ہالی کو لے آؤ اسے سینے سے لگا لوں تو....."

"بس کرو ہادی....." میرے لبوں سے یہ مشکل نکلا تھا۔ آنسوؤں نے میرے حلق میں گولا سا بنا دیا تھا۔

"کب سے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تمہیں، کتنی بار مس ربانی کے دروازے تک بھی پہنچا..... لیکن تمہارا پتا نہیں چل سکا..... آج آفس میں اگر اخبار پر نظر نہ پڑتی تو..... مجھے ایک سال ہو گیا ہے اس شہر میں آئے لیکن میں نے کبھی مقامی اخبار نہیں پڑھا..... خیر....." اس نے ایک گہری سانس لی۔

"پالنے والے ماں، باپ سے ملنا ہی لیکن جنم دینے والی ماں سے ایک بار ضرور ملنے بھی جانا سویرا اقبال، جس کی نظریں ہر دم دروازے کی طرف ہی لگی رہتی ہیں۔" وہ جانے کے لیے مڑا۔

"ہادی....." میرے حلق سے چیخ کی طرح نکلا تھا اور پھر میرے اندر سے سمندر ابل پڑے، برسوں سے منجمد گلیشیر پگھل رہے تھے، میں پتا نہیں کیسے اٹھی تھی، کیسے میز کے پیچھے سے نکل کر ہادی تک آئی تھی اور اس کا بازو تھامے بلک رہی تھی اور وہ ساکت کھڑا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی میں اس کا بازو تھامے بلکتی رہی پھر اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر ہولے سے سہلایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مت رو ویرا مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" اس نے آہستہ سے اپنا بازو چھڑا لیا اور جانے کے لیے پلٹا۔

"نہیں..... نہیں ہادی اس طرح مت جاؤ، اتنے برسوں کے بعد ملے ہو تو یوں خفا ہو کر مت جاؤ پلیز کچھ دیر تو بیٹھو..... سنو، میں بھی بہت تڑپی ہوں، بہت روئی ہوں اور پلیز میرا یقین کرو ہادی، تمہاری محبت..... ایک تمہاری ہی محبت پر تو اعتبار تھا مجھے..... اور اسے ہی تو زندہ رکھنا چاہتی تھی ہمیشہ....." اس نے بے حد شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"اسے زندہ رکھنا چاہتی تھیں؟ میری محبت کو اور مجھے ہی مار دیا۔"

"نہیں....."

میری آنکھیں پھر سمندر بن گئیں۔

"تم بہت احمق ہو ویرا۔" اس کے تنے ہوئے نقوش ڈھیلے ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھوں سے ہنوز ناراضی جھلکتی تھی۔

"پلیز ہادی کچھ دیر تو بیٹھ جاؤ، مجھے بتاؤ اماں کے متعلق ابا کے متعلق..... استانی جی اور انکل کے متعلق۔ اچھا چلو یہ ساتھ ہی میرا گھر ہے وہاں چل کر آرام سے بات کرتے ہیں۔" میں نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ میں نے جلدی سے میز پر پڑا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا تو اس نے بغور مجھے دیکھا اور واش روم کی طرف اشارہ کیا۔

"جاؤ منہ دھو کر آؤ۔"

"ہاں۔" اب میں ان روئی آنکھوں اور بھیگے چہرے کے ساتھ باہر جاتی تو دیکھنے والے جانے کیا کیا گمان کرتے..... میں فوراً واش روم کی طرف چلی گئی اور جب اچھی طرح چہرہ دھو کر اور تازہ لپ اسٹک لگا کر باہر آئی تو وہ بے حد سنجیدہ سا بیٹھا تھا میرے آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا..... اور کچھ دیر بعد وہ میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

"اکیلے رہتے ڈر نہیں لگتا تمہیں.....؟ تم تو بہت ڈرپوک ہوتی تھیں۔"

اسے شاید بہت پہلے کی بات یاد آئی تھی۔

"پہلے ہاسٹل میں رہتی تھی پھر جب اس سیٹ پر

آئی تو.....“ میں اسے مختصر لفظوں میں بیتے سالوں کی ساری روداد سنا رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے بتایا کہ وہ کتنی بار میانے بزارے گیا اور یہ کہ اماں چاہتی تھیں کہ میں پڑھ جاؤں، میرا شوق دیکھ کر ہی انہوں نے دل پر پتھر رکھا تھا وہ مجھے ملنے اس لیے نہیں آتی تھیں کہ کہیں ان کا دل بے ایمان نہ ہو جائے اور وہ مجبور ہو کر مجھے استانی جی کے گھر سے لے جائیں۔

”میں نے ہر وہ بات ان سے کہہ دی ویرا جو تم نہیں کہہ سکتی تھیں۔“ اب اس کی آنکھوں میں نرمی تھی...... اور وہی محبت بھری حدت جو ہمیشہ ہوتی تھی۔

”تمہارے ابا حیران ہو کر میری باتیں سنتے تھے کہ اتنی چھوٹی عمر میں تم اس طرح سوچتی تھیں۔ انہیں اگر تمہارے خیالات کا علم ہو جاتا تو وہ ضرور تمہیں گود میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلاتے، انہوں نے کہا انہوں نے کبھی بیٹیوں کی پیدائش پر گلہ یا ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ اللہ نے بیٹا بھی تو دیا تھا ناں شکر ادا کرنے کے لیے...... اور وہ کتنے بھی تھے وہ تم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں کیونکہ تم ان سے دور ہو۔“

میری آنکھوں سے پھر جھرنے پھوٹ پڑے تھے۔

”اور امی کہتی ہیں کہ انہوں نے تمہیں کبھی اس لیے امی کہنے کے لیے نہیں کہا کہ کہیں تمہیں اچھا نہ لگے کیونکہ تم چھ سال کی تھیں تب اور تمہیں پتا تھا کہ تمہاری اماں اور ابا کون ہیں اور استانی جی تمہاری امی نہیں ہیں حالانکہ ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ تم انہیں بھی امی کہو......“

”ہاری میں بہت بے وقوف ہوں۔“

”ہاں......“ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ کو میں نے نمودار ہوتے نہیں دیکھا لیکن مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو...... لیکن جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ سنجیدہ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔

”ہاں ویرا تم...... تمہارے اندر جو یہ ادیب و شاعر چھپا بیٹھا تھا ناں...... اس نے تمہیں حساس بنا دیا تھا ورنہ ہر گھر کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں، اکثر والدین اس طرح اپنی اولاد سے اپنی محبتوں کا اظہار نہیں کرتے...... لفظوں میں پیار کر کے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں اولاد سے محبت نہیں ہے، تمہارے ابا صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کر کے گھر آتے تو اتنے تھکے ہوئے ہوتے ہوں گے کہ بچوں سے لاڈ کرنے، پیار کرنے کے لیے ان کے پاس نہ وقت ہوتا ہوگا، نہ ہمت اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ...... وہ تم سے محبت نہیں کرتے تھے اور امی تمہارے جانے کے بعد وہ اکثر کہتی تھیں پیدا کرنے سے زیادہ پالنے کی محبت ہوتی ہے اور یہ پالنے کی محبت بڑی ظالم ہوتی ہے۔“

”لیکن پھر بھی ہاری، محبت کو اظہار کی ضرورت تو ہوتی ہے، ہمیشہ نہ سہی کبھی، کبھی تو......“ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ”اگر تم مجھ سے محبت کا اظہار نہ کرتے تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“

”خیر مجھے تو پتا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا تو میں محجوب سی ہو گئی۔

”تم نے سب کا بتایا ہاری اپنے بیوی، بچوں کا نہیں بتایا، کیا یہاں ساتھ ہی رہتے ہیں یا استانی جی کے پاس......؟“

”اول تو یہ کہ تم نے پوچھا ہی نہیں اور دوئم یہ کہ بیوی ہی نہیں ہے تو بچے کہاں سے آئیں گے۔“

”تو...... تو کیا تم نے شادی نہیں کی ابھی تک......؟“ وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور مجھے لگا جیسے میرے دل کی جلتی بلتی زمین پر کہیں سے ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے لگ رہا تھا جیسے پیاس سے میرے حلق میں کانٹے اگ آئے ہوں لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ٹھنڈے،

میٹھے پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگا دیا ہو۔

"ہاں اگر ہو سکے تو ایک بار اپنی انا کو بھول کر میانے ہزارے کا چکر ضرور لگا لینا۔" چہرے پر گہری سنجیدگی لیے وہ مڑا تو میں نے بے اختیار کھڑے ہوتے ہوئے اسے بلایا۔

"لیکن باری تم نے تو کہا تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ میانے ہزارے لے کر جاؤ گے تو کیا بھول گئے؟"

"نہیں، میں تو نہیں بھولا لیکن شاید تم بھول گئی تھیں۔" وہ یک دم واپس مڑ کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ......

"میں نے کچھ اور بھی کہا تھا دیرا...... لیکن تمہیں یاد نہیں۔"

"مجھے یاد ہے۔" میری نظریں جھک گئیں اور پلکیں لرزنے لگیں یوں جیسے میں کوئی ٹین ایجر لڑکی تھی۔

"تو تمہیں یہ تو نہیں لگے گا کہ میں تم سے شادی تم پر احسان کرنے کے لیے کر رہا ہوں؟"

میری لرزتی پلکوں پر موتی اٹک گئے۔ پتا نہیں آج کہاں سے اتنا پانی میرے اندر سا گیا تھا۔

"محبت احسان نہیں ہوتی دیرا......" اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے میری پلکوں کے موتی چن لیے۔

"اور محبت کو کبھی احسان مت سمجھنا۔" اس نے تنبیہہ کی...... "اور یاد رکھنا...... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اتنی کہ ان سارے بیتے سالوں میں اللہ سے میں نے اس ایک دعا کے سوا اور کوئی دعا نہیں مانگی کہ تم مجھے مل جاؤ...... اور میری محبت کا یقین کر لو۔"

"تمہاری محبت کا یقین مجھے ہمیشہ رہا باری، میں کبھی بے یقین نہیں ہوئی۔" مجھے لگا میرے ہاتھوں کے ساتھ میری آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"اور کبھی بے یقین مت ہونا دیرا۔" اس نے میرے لرزتے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

"دیکھو دیرا ہو سکتا ہے میانے ہزارے کے اس کچے بڑے سے دھیڑے میں رہنے والی تمہاری اماں کو تمہاری طلب نہ ہو لیکن یہ کبھی مت سوچنا کہ انہیں تم سے محبت نہیں تھی...... یہ محبت تو خود بخود ماں اور اولاد کے درمیان وجود پاتی ہے، بڑھتی ہے اور تناور درخت بن جاتی ہے۔" وہ ہولے، ہولے دھیمے لہجے میں ایک بار پھر سمجھا رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میرے اردگرد پھول برس رہے ہوں۔ جیسے تپتے صحراؤں سے میں یکا یک ہرے بھرے گلستانوں میں آ گئی ہوں، میرے پاؤں تلے نرم ٹھنڈی مخملی گھاس ہو اور میرے چاروں طرف ٹھنڈی خوشبودار ہوائیں چلتی ہوں۔ اس روز میں باری کے ساتھ سیالکوٹ آئی تھی اور استانی جی کے گلے لگ کر بے تحاشا آنسو بہاتے ہوئے میں نے ان سے معافی مانگی تھی...... اور پہلی بار انہیں امی کہہ کر بلایا تھا۔ استانی جی نہال ہو رہی تھیں اور صوبیدار انکل خاموش ہو کر ہمیں دیکھتے تھے...... اور پھر اگلے دن میں باری کے ساتھ میانے ہزارے آئی تھی...... نو سال کی عمر میں میانے ہزارے سے بچھڑ کر آج پھر وہاں تھی...... اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے کھڑے میری ہمت جواب دے گئی تھی لیکن باری نے مجھے سہارا دیا اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اندر قدم رکھنے کا حوصلہ نہ کر پاتی لیکن وہ تھا میرے ساتھ اور میں نے اس کے ساتھ جیسے سیکڑوں سالوں کے بعد اس بڑے سے کچے صحن میں قدم رکھا تھا جہاں میں نے کتنی ہی بار پیو کے ساتھ ایکلی ڈالی تھی اور پھر چکرا کر گر پڑتی تھی۔ اندر وہی منظر تھا جو میری آنکھوں کی پتلیوں میں ٹھہر سا گیا تھا۔ لمبا سفید اور سیاہ ڈبیوں والا کھیس اوڑھے نیم دراز تھے اور پاس ہی حقہ پڑا تھا اور ان کی چارپائی کی پائنتی ہی تو جمال ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ہاں وہ جمال ہی تو تھا جسے میں نے صرف چند دن کا دیکھا تھا۔ اور اماں چولہے سے جلتے انگارے نکال کر ایک پترے پر

ڈالے ابا کے حقے کے لیے لا رہی تھیں۔

"اماں......!" میں باری کا ہاتھ چھڑا کر ان کی طرف بھاگی...... چمٹا، اماں کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا...... وہ تیر کی طرح میری طرف آئی تھیں...... دوسرے ہی لمحے ہم ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔

"بالی...... بالی یہ تو ہے ناں...... میری بچی......" وہ بار، بار میرا منہ چومتیں، دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر مجھے دیکھتیں...... آج ان کی آنکھوں میں بھی سمندر سما گئے تھے۔ ابا بار، بار کھیس کے کونے سے آنکھیں پونچھتے تھے اور جمال حیران سا مجھے دیکھتا تھا۔ اماں کے بازوؤں سے نکل کر میں ابا سے لپٹ گئی۔

"ابا...... ابا......" میری ہچکی بندھ گئی۔

"چپ کر نہ رو جھلی نہ ہو تو......" ابا ہولے، ہولے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے تھے۔

شام تک میری چاروں بہنیں بھی اپنے، اپنے بچوں کے ساتھ آ گئی تھیں...... اور آنکھوں میں خوشگواری حیرت لیے ہوئے مجھے گھیرے میں لیے بیٹھی تھیں۔ والی، دبئی میں تھا اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ۔

"والی اب پتا نہیں کیسا ہے؟" میں نے بہو سے ہولے سے پوچھا تھا...... لیکن جواب اماں نے دیا تھا۔

"گبھرو جوان ہے، تیری شادی پر بلاؤں گی اسے یوں بھی سال بعد چھٹی پر آتا ہے۔ تب ہی شادی کی تاریخ رکھوں گی۔" اماں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"میری شادی......؟" میں نے دھڑکتے دل سے باری کی طرف دیکھا جو سامنے ہی چارپائی پر جمال کے ساتھ بیٹھا تھا اور گاہے، گاہے مجھے بھی دیکھ لیتا تھا...... اس نے راستے میں کہا تھا۔

"ویرا! میرے امی، ابو بہت جلد بہت چاہ سے پوری عزت واحترام کے ساتھ تمہیں تمہارے اماں، ابا سے مانگنے آئیں گے۔" باری نے مجھے کتنا مان دیا تھا۔

"ہاں تمہاری شادی......" اماں جیسے جھوم گئی تھیں۔

"استانی جی تاریخ لینے آئیں گی بہت جلد...... باری نے کہا ہے اور ان کا ہی تو سب سے زیادہ حق ہے تم پر...... اور باری بہت اچھا ہے...... ہے ناں؟" وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔

میری پلکیں جھک گئیں...... رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"ہم نے آج تک تیرے لیے کچھ نہیں کیا ناں بالی، تیرے ابا کی خواہش ہے کہ دھوم، دھام سے تیری شادی کریں...... تیرا بھائی دبئی میں ہے ناں...... اچھا کماتا ہے، تیرے لیے بھی زیور بنا کر رکھا ہے میں نے...... ہم سے تمہارے معاملے میں جو کوتاہی ہوئی ہے، معاف کر دینا لیکن میں نے تو صرف تمہارا بھلا چاہا تھا۔"

"اماں...... اماں......" میں ایک بار پھر ان سے لپٹ گئی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے اماں...... کچھ بھی نہیں...... بس آپ کی محبت مجھے مل گئی ہے ناں......" میری آواز میں نمی گھل گئی تھی اور اماں کی آنکھیں برس رہی تھیں...... اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک عمر کی آبلہ پائی کے بعد زخموں کو مرہم مل گیا ہو...... اور میرا خالی دل محبتوں سے لبریز ہو گیا ہو...... میں نے اماں کے کندھے پر سر رکھے، رکھے باری کی طرف دیکھا۔ جو آنکھوں میں محبتوں کا جہاں بسائے مجھے ہی دیکھ رہا تھا...... اور یہ میں تھی سویرا اقبال...... جو ہمیشہ خود کو کمتر اور مظلوم سمجھتی رہی...... لیکن آج میرے اردگرد کتنے رنگ تھے اور روشنیاں تھیں، محبتیں تھیں۔